کے مفید اصول بیان کیے ہیں، جامعہ کے اہل قلم میں پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، عبد اللہ ولی بخش قادری، عبد اللطیف صاحب اعظمی اور انور صدیقی کے مضامین لائق مطالعہ ہیں، غالب کی کتابوں میں اردوئے معلّٰی، دیوان اور عود ہندی کے بعض اڈیشنوں کے متعلق مختصر مگر مفید مضامین ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر غالب سے متعلق مفید، سنجیدہ و متوازن مضامین پر مشتمل اور خاصے کی چیز ہے۔

آجکل غالب نمبر ۔ مرتبہ شہباز حسین صاحب لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۴ قیمت ۶۰ پیسے، پتہ: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

دلی کے سرکاری رسالہ "آجکل" کا خاص نمبر بھی مفید مضامین پر مشتمل ہے، منظور الحسن صاحب برکاتی کا مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں رسالہ سوالات عبد الکریم کے جس کو غالبیات کے بعض ماہرین بھی غالب ہی کی تصنیف خیال کرتے ہیں اصل مصنف عبد الکریم کی شخصیت کا غالباً پہلی بار پتہ لگا کر تعارف کرایا گیا ہے، "کلام غالب کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو" (ڈاکٹر مسعود حسین خاں) "محاورات غالب" (ضیاء احمد بدایونی) "دلی کی سماجی زندگی خطوط غالب کے آئینہ میں" (سخی حسن نقوی) "غالب کے ایک شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت کی تصنیف "انشائے نور چشم" (عبد القوی دسنوی) خاص طور سے مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ نظم کے حصہ میں فراقؔ، روشؔ، منور لکھنوی، جگن ناتھ آزاد اور سلام مچھلی شہری وغیرہ شعراء کا نذرانۂ عقیدت ہے، غالب اور انکی کتابوں کے بعض قدیم اڈیشنوں کے عکسی فوٹو بھی ہیں، اور مختصر ہونے کے باوجود بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

ض

(باقی)

جلد ۱۰۳ - ماہ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۹ء - عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

لکھنؤ کا شیعہ سنی فساد اس قدر شرمناک ہو کہ تاسف اور ملامت کے حدود سے باہر ہے، یہ کس قدر شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ ان مقدس اور برگزیدہ ہستیوں کے نام پر یہ بربریت کیجاتی ہے جنھوں نے پوری دنیا کو امن و سلامتی کا پیام دیا اور اس کے سامنے ایثار و قربانی کا عملی نمونہ پیش کیا، آج ان کے نام لیوا آپس ہی میں کٹے مرتے ہیں، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے، اور شیعہ سنی چودہ سو برس کے فرسودہ اور بے نتیجہ جھگڑوں میں مبتلا ہیں، انکو مسلمانوں کے نازک حالات سے بھی سبق حاصل نہیں ہوتا، ان کے سامنے یہ مثال بھی موجود ہے کہ ہمارے وطنی بھائی اور حکومت دونوں اچھوتوں تک کو جو ہندو مذہب کے رو سے عام ہندوؤں سے الگ طبقہ ہے اور جن میں وطنیت کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں ہے، ملانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور شیعہ سنی جن کا پیغمبر ایک، کتاب ایک، قبلہ ایک اور بہت سے عقائد و عبادات تک یکساں ہیں، برادر کشی میں مبتلا ہیں، اور یہ اختلاف کسی بنیادی عقیدہ کا نہیں بلکہ بدعات اور رسوم پر اصرار کا نتیجہ ہے، آج کوئی سنجیدہ شیعہ کم سے کم علانیہ تبرے کو پسند نہیں کرتا، بلکہ اس سے اعلانِ برأت کرتا ہے اور بہت سے شیعہ مفکرین جنکی امت کے مصالح پر نظر ہے، اسرے سے تبرا کے خلاف ہیں، یہی حال مدحِ صحابہ کے مروجہ جلسے اور جلوس کا ہے جو سراسر بدعت ہیں، اور ان دونوں پر اصرار مسلمانوں کے مصالح کے خلاف ہے، میلاد کی مجالس الگ چیز ہیں، ان پر شیعوں کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا، لطف یہ ہے کہ اس اختلاف کے باوجود سنی محرم کی تمام بدعتوں میں مبتلا ہیں، بلکہ اسکی ساری رونق ان ہی کے دم سے قائم ہے، اگر ان میں مذہب کا سچا جذبہ ہے تو پہلے انکو محرم کی بدعتوں کو چھوڑنا چاہیے،

شیعہ سنیوں کے لیے یہ بڑے شرم اور غیرت کا مقام ہے کہ ان کے اختلاف میں حکومت بلکہ جن سنگھ تک کو مداخلت کی ضرورت پیش آئے اور ان کو نقصان مایہ کے ساتھ شماتت ہمسایہ کا بھی

تلخ گھونٹ پینا پڑے، اگر وہ اپنی ضد اور جہالت پر قائم رہے تو دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ اور ان میں ایک مستقل کشمکش پیدا ہو جائے گی جس کا نتیجہ جانی اور مالی نقصان کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا، اس سے سیاسی پارٹیاں فائدہ اٹھائیں گی، کسی فریق کو انکی ظاہری ہمدردی سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، مسلمانوں کے معاملات و مسائل ہیں، ان سب کا نقطۂ نظر ایک ہے، اس میں شیعہ سنی کی تفریق نہیں ہے، اور اب تک مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے اس میں شیعہ سنی برابر کے حصہ دار ہیں، خاص طور پر شیعوں کو ان کے فریب سے زیادہ ہشیار رہنے کی ضرورت ہے، ممکن ہے فرقہ پرور پارٹیوں کی ظاہری ہمدردی سے ان کے جذبات کی تسکین ہو جائے، لیکن کوئی سیاسی پارٹی اور حکومت سنیوں کی اکثریت کو نظر انداز نہیں کر سکتی، اس لیے دونوں کا فائدہ اتحاد ہی میں ہے،

شیعہ سنیوں کا سنجیدہ طبقہ اس اختلاف اور معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتا، یہ سارا فتنہ دونوں کے عوام اور خود غرض لیڈروں کا پیدا کردہ ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ دونوں کے سنجیدہ اور معقول اشخاص اسکا مستقل حل نکالنے کی کوشش کریں اور شیعہ سنی کی ایسی تقریبات کے لیے جن میں فساد کا اندیشہ ہو ایسے ضوابط اور حدود مقرر کر دیے جائیں جن کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہو، اور ان تقریبات کے موقعہ پر یہ لوگ خود اسکی نگرانی کریں تاکہ آیندہ فساد کی نوبت نہ آنے پائے۔

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ پاکستان کے تاجران کتب نے دار المصنفین کی بہت سی کتابیں چھاپ لی ہیں، اور اسکا سلسلہ برابر جاری ہے، دار المصنفین کو حکومت سے کوئی مستقل مدد نہیں ملتی، کبھی کبھی کسی خاص کام کے لیے عارضی مل جاتی ہے، اسکی آمدنی کا دارومدار کتابوں کی تجارت پر ہے جن کی زیادہ مانگ پاکستان میں ہے، اگر وہاں اس کی کتابیں چھپ گئیں تو اس کا چلنا دشوار ہو جائیگا۔ دار المصنفین کے قدر دانوں کی بڑی جماعت پاکستان میں ہے، چنانچہ جب پہلی مرتبہ ہم نے پاکستان کے ناشروں کی شکایت کی تھی تو لاہور کے اخبارات خصوصاً چٹان نے ان کے خلاف پر زور آواز

بلند کی تھی، بعض با اثر شخصیتوں نے بھی ان کو روکنے کی کوشش کی تھی، مگر کا مفید نتیجہ نکلا تھا، اس مرتبہ پاکستان کے نامور صاحب علم و قلم سید حسام الدین صاحب راشدی نے ان ناشروں کے خلاف مضمون لکھا جو جنگ اور حریت میں شائع ہوا، پاکستان کے سابق ڈپٹی ہائی کمشنر برائے ہند فضل اقبال صاحب نے بھی جو دار المصنفین کے ہمدردوں میں ہیں، وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کے تدارک کی کوئی شکل نکالنے کی کوشش کریں گے۔ دار المصنفین ان سب محسنوں کا شکر گذار ہے۔

بعض ہمدردوں نے ان تاجروں اور ان کی شائع کردہ کتابوں کے نام لکھکر بھیجے ہیں جن کو ہم عام اطلاع کے لیے شائع کرتے ہیں: (۱) عشرت پبلشنگ ہاؤس اسپتال روڈ لاہور، شعر الہند حصہ اول و دوم، گل رعنا، مقالات شبلی حصہ دوم و چہارم (۲) اسٹار بک ڈپو اردو بازار لاہور، شعر العجم حصہ اول و دوم (۳) تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور، شعر العجم حصہ سوم (۴) حاجی فرمان علی اینڈ سنز اردو بازار لاہور، شعر العجم حصہ چہارم و پنجم (۵) مکتبہ ادب اردو، اردو بازار لاہور، اقبال کامل

سیرۃ النبی اور تاریخ اسلام کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ کوئی تاجر انکو شائع کر رہا ہے، اور دھوکا دینے کیلئے سیرۃ النبی مطبوعہ دار المصنفین کا بلاک چھاپ رہا ہے، تاکہ ناواقف اسکو دار المصنفین کی مطبوعہ سمجھیں، مولانا شبلی نے اپنی ان کتابوں کی رجسٹری نہیں کرائی تھی جو انکی زندگی میں شائع ہوئی تھیں، اسلیے انکی طباعت و اشاعت پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے، لیکن اخلاقاً دار المصنفین انکا وارث ہے، مگر انکی وفات کے بعد انکی جو کتابیں دار المصنفین نے شائع کی ہیں مثلاً سیرۃ النبی حصہ اول و دوم مقالات شبلی اور شعر العجم حصہ پنجم انکا حق طباعت محفوظ ہے اور وہ قانوناً بھی دار المصنفین کی ملکیت ہیں، مگر ملک کے اختلاف کی وجہ سے انکے ناشروں کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کیجا سکتی، اس لیے یہ پاکستان کے مخلصوں کا فرض ہے کہ وہ ان خود غرض تاجروں کو دار المصنفین کو نقصان پہنچانے سے روکنے کی کوشش کریں، اسکی کتابوں کا اسٹاک پاکستان میں (۱) شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور (۲) ادارۂ بتول اچھرہ لاہور (۳) [illegible] تاجر کتب ۱۳، وحید آباد کراچی کے یہاں رہتا ہے، ان لوگوں کو ضرورت ہو ان سے طلب کریں۔

مقالات

عبد القادر نورس اور اس کا کلام

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عادل شاہی دور کا ایک شاعر جس کا تخلص تو مشہور ہے، مگر کلام نایاب تھا، عبد القادر نورس دنورسی ہے۔ اس کا تعلق اس خاندان کے تین بادشاہوں سے رہا ہے، یعنی ابراہیم عادلشاہ ثانی (م ۱۰۳۵ھ) محمد عادل شاہ (م ۱۰۶۷ھ)، علی عادل شاہ ثانی (م ۱۰۸۳ھ)۔ اس شاعر کی شہرت کی بنیاد محض اس کا تخلص ہے، ابراہیم عادل شاہ کو لفظ "نورس" سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اس بنا پر اس کے دور کی متعدد چیزیں اس نام سے منسوب ہوئیں، نورس شاعر جس کا تخلص نورسی بھی ملتا ہے، اسی وجہ سے گمنامی سے بچ گیا، مگر تخلص کے علاوہ اس کے متعلق ہماری معلومات اور کچھ نہیں، فارسی تذکرے اس کے ذکر سے خالی ہیں، البتہ ابراہیم زبیری نے اپنی تاریخ 'بساتین السلاطین' میں اسکو اپنے دور کا ممتاز شاعر قرار دیا ہے،[1] حال ہی میں راقم الحروف کو مدراس کے کتبخانۂ دولتی مخطوطات شرقی (Govt Oriental Mss. Library) میں اس شاعر کے دیوان کا ایک نادر[2]

---

[1] طبع حیدرآباد، ص ۲۵۰ [2] مخطوطہ فارسی زیر شمارہ ۵۹۰

مخطوطہ ملا، اس کے مطالعہ سے اس شاعر کے بارے میں بعض ضروری باتیں معلوم ہوئیں، جنھیں سطور ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

نام و تخلص | اس کا نام عبدالقادر تھا۔ ’بساتین السلاطین‘[۱] کے بیان کے علاوہ نورس خود اپنی ایک غزل میں اپنا نام[۲] مع تخلص لایا ہے:-

طی دادی داز گوں زد نعل ما دیوانگاں
شیخ عبدالقادر نورس کجا پی می برد

وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا بڑا معتقد تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکے خاندان کو شیخ سے عقیدت رہی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا نام شیخ کے نام پر رکھا گیا ہو۔

عبدالقادر دو تخلص استعمال کرتا تھا کبھی نورسی اور کبھی نورس حسب ذیل ابیات سے اس کی پوری طرح توثیق ہوتی ہے۔ نورسی تخلص کی مثالیں:-

خضر وقت خویش خواہد گفت ازا نورسی   گر کنی چشم تر ما چشمۂ حیوان ما   (ورق ۱)

جز شعر نورسی ننویسم بہر بیاض   زیرا کہ خوش نیاید شعر دگر مرا   (ورق ۲ ب)

گرچہ ما داغیم در صورت سراپا نورسی   لیک در معنی یکی رنگیں گلستانیم ما   (ایضاً)

نورس تخلص کی مثالیں:-

نبود نہ لفت مرا خال در راہ تو زد نورس   (ورق ۴ ا)

چہ ناپسند کسی تو دریں جہاں نورس   کہ استخوان تو زاغ و ہما گرفت و گذاشت   (ورق ۱۰ ا)

اشک نورس می فزاید نور اندر چشم من   (ورق ۶ ب)

قرین قیاس یہی ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کی لفظ "نورس" سے غیر معمولی دلچسپی اس تخلص کے انتخاب کی محرک ہوئی ہوگی، جیسا کہ ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین[۳] میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے،

[۱] ص ۲۵۰ [۲] دیوان ورق ۳۴ ا [۳] ص ۲۵۰

"بسبب مقبول و مطبوع آمدن این لفظ (نورس) بر خاطر نازک پسند بادشاہ نازک پسندان عصر بموجب "الناس علی دین ملوکہم" این لفظ پسند کردہ باستعمال خود آوردہ اند چنانچہ ظہوری نام دیباچہ کہ در مدح آں ممدوح زماں گفتہ دیباچۂ نورس[۱] نام گذاشت و محمد قاسم فرشتہ کتاب مولف خود کہ در فن تاریخ پرداختہ نورس نامۂ فرشتہ موسوم گردانیدہ و عبدالقادر نورسی کہ شاعر فصیح بود تخلص خویش نورسی قرار دادہ"۔

ابراہیم عادل شاہ کے دور کا ایک شاعر رشید قزوینی ہے، اس کا بھی تخلص نورس تھا، اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اس نے بھی اسی مقصد کے تحت یہ تخلص اختیار کیا تھا، لیکن بادشاہ مذکور کے دربار سے وابستگی سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے، عبدالقادر نورس کے برخلاف رشید کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، اور نام ہی کے اختلاف سے ایک تخلص کے ان دونوں شاعروں کے درمیان امتیاز ہو جاتا ہے ورنہ ایک ہی بادشاہ کے دور میں ہونے کی وجہ سے التباس کا موقع تھا، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ عبدالقادر کے مقابلہ میں رشید قزوینی زیادہ مشہور تھا، چنانچہ عبدالقادر کا ذکر میرے مطالعہ کئے ہوئے کسی تذکرہ میں موجود نہیں، اور رشید قزوینی کا ضمنی ذکر اکثر تذکرہ نگاروں کے یہاں پایا جاتا ہے[۲]۔

علاوہ نام کے اختلاف کے ان دونوں ہم عصر (اگرچہ عبدالقادر چھوٹا تھا اور محمد اول علی عادل شاہ کے عہد تک اس کا بقید حیات رہنا مسلّم ہے) شاعروں کے الگ الگ شاعر ہونے کے یہ بھی قرائن ہیں:

[۱] دیباچہ کا کوئی مخصوص نام نہ تھا بلکہ بادشاہ کی تالیف نورس کا دیباچہ تھا، اس بنا پر دیباچۂ نورس کہلایا، اس کا یہ کوئی مخصوص عنوان نہ تھا۔ [۲] مثلاً عرفات عاشقین نسخہ بانکی پور، ورق ۱۸۱ ا، مجمع النفائس نسخہ بانکی پور ۲۹۶ ا، ید بیضا نسخہ بانکی پور ورق ۳۲۸، مخزن الغرائب نسخہ علی گڑھ، ریاض الشعراء نسخہ علی گڑھ ورق ۱۷۴ ا، منتخب الاشعار فہرست بادلی نمبر ۳۷۹ (۶۹۸) وغیرہ

۱۔ رشید کا تخلص نورسؔ ہے، اور عبدالقادر کا نورسؔ اور نورسیؔ دونوں۔

۲۔ رشید کے بارہ شعر عرفات عاشقین، ریاض الشعراء وغیرہ میں منقول ہیں، ان میں سے کوئی بھی عبدالقادر کے دیوان میں نہیں ہے۔

۳۔ عرفات عاشقین کے مولف نے واضح طور پر لکھا ہے، وہ ان ہی دنوں میں فات پاچکا تھا،[1] تذکرہ عرفات ۱۰۲۴ھ کے قریب مرتب ہوا، اس بنا پر اس تاریخ سے قبل رشید قزوینی کا فوت ہو جانا قطعی ہے، جبکہ ہمارے شاعر کے دیوان میں علی عادل شاہ کی تخت نشینی کے بعد تک واقعات واضح طور پر موجود ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری کے اواخر اور بارہویں صدی کے اوائل میں ایران میں بھی ایک شاعر نورس تخلص کا گذرا ہے، اس کے دیوان کا ایک نادر مخطوطہ برٹش میوزیم کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ ریو کی فہرست[2] کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ شاعر ہمارے پیش نظر شاعر سے الگ شخصیت کا مالک تھا، اس کے وجوہ یہ ہیں:۔

۱۔ آخر الذکر شاعر کا نام محمد حسین[3] تھا، اور وہ دماوند کا باشندہ تھا، کچھ دنوں کے بعد اصفہان چلا آیا اور صفوی سلطان سے وابستہ ہو گیا۔ اور بیجاپوری نورس کا نام عبدالقادر تھا، اس کے اور حالات نہیں ملتے۔

۲۔ محمد حسین نورس کے اکثر قصائد شاہ سلیمان کی مدح ہیں، اور ہمارے شاعر نے کوئی نظم اس نام کے ممدوح کے لیے نہیں لکھی۔

---

[1] عرفات العاشقین: میوہ نورس ریاض اقدس مولانا رشید نورس تخلص از شعرای نورسیدہ تازہ گوی این زمانست، در ملازمت عادلشاہ می باشد، طبیعت خوب دارد ولادت از قزوین بودہ گویند دریں دیار میوۂ وجودش بباد فنا رفتہ (ورق ۱۰۷، ۱) [2] تکملۂ فہرست ریو شمارہ ۳۳۳ [3] تذکرۂ بے نظیر ۱۲۳

۳۔ نورسؔ دماوندی کے اکثر قطعات ۱۰۸۴ھ سے ۱۱۰۵ھ کے درمیان کے ہیں، نورسؔ (بیجاپوری) کے مقطعات ۱۰۱۹ھ تا ۱۰۶۹ھ کے ہیں، ظاہر ہے جو شاعر ۱۰۱۹ھ میں شعر کہتا ہو اسکا ۱۱۰۵ھ کے بعد تک شعر کہنا جب تک کسی اور قرینہ سے اس کی عمر سو سال سے زیادہ ثابت نہ ہو جائے، مستبعد نظر آتا ہے،

۴۔ دونوں شاعروں کے دیوان بالکل مختلف ہیں، نورس (بیجاپوری) کا دیوان غزلیات مقطعات، رباعیات اور ایک مختصر ساقی نامہ پر اور نورس دماوندی کا دیوان، قصائد مذہبی، قصائد در مدح ممدوحان دنیوی، غزلیات، متفرقات، مثنوی قضا و قدر، معمات اور مختصر نثری رسالے پر مشتمل ہے۔ دونوں دیوانوں کی ابتدا و انتہا مختلف ہے، اور دونوں کی ضخامت میں بھی کافی تفاوت پایا جاتا ہے۔

وطن و خاندان اگرچہ نورس کے متعلق معلوم نہیں کہ اس کا وطن کہاں تھا، مگر خود دیوان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن اور گجرات میں اس کی حیثیت "غیر ملکی" تھی، مگر یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خود یا اس کے خاندان کے افراد کہیں باہر سے آئے تھے، کیونکہ جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اس کا ایک بھائی گجرات میں مقیم تھا اور وہاں وہ بڑی دولت چھوڑ کر مرا تھا، حسب ذیل بیت[1] دکن میں اس کی غیر ملکی حیثیت کی مظہر ہے:

اہل دکن از عیب ہنر را نشناسند ۔۔۔ یارب ز کجا نورسؔ ما در دکن افتاد

ز خوبان دکن ہر دم تمنای وفا دارم ۔۔۔ عجب خوش سادہ لوحم، بیں چہ در دل مدعا دارم

اگرچہ دوسرا شعر اس کا قطعی ثبوت نہیں، لیکن "خوبان دکن" کی بے وفائی میں شاعر کے غیر ملکی ہونے کی داستان پنہاں معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] دیوان ورق ۲۵ ب، ۶۲ ب (بالترتیب)

اس کے دیوان میں گجرات اور خاندیس کا ذکر ملتا ہے، مگر دونوں میں کسی سے اس کا وطنی تعلق نہیں تھا، خاندیس میں وہ دکن سے گیا تھا، (اور جیسا کہ آگے معلوم ہوگا، اس کا قیام وہاں عارضی رہا ہوگا) جیسا کہ وہ کہتا ہے:[1]

نورس دگر از دکن بخاندیس   از بہر حسن محمد آمد

گجرات کے متعلق اس کے خیالات اچھے نہ تھے، مثلاً[2]

منصبش دادہ گو جراتی را   کہ نداند نحو ز دارائی

اس سے پوری طرح واضح ہے کہ نورس کا وطنی تعلق گجرات سے نہ تھا، ممکن ہے وہ ایرانی الاصل ہو، اس سے زیادہ اس کے وطنی تعلق کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ اس کے دیوان میں خاندان کے متعلق بعض جزوی تفصیلات ملتی ہیں، مثلاً

۱- نورس کے تین اور بھائی بہن تھے، لیکن اس کی ماں نورس کو سب سے زیادہ چاہتی تھی،[3]

سہ تا داشت فرزند جز من ولی   ہمیشہ مرا خواستی زاں سہ تا

چونکہ فرزند کا اطلاق اولاد ذکور و اناث دونوں پر ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھائی کے تھے اور بہنیں کتنی، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ایک بھائی اور ضرور تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۲- ماں کا انتقال ۱۰۱۹ھ میں ہوا، اس سلسلے میں اس کا ایک مفصل قطعہ ہے جو شاعری کا اچھا نمونہ ہے، اس لیے اس کے اکثر اشعار درج[4] ذیل ہیں:

چو رفت از جہاں حضرت والدہ   جہاں گشت تاریک در چشم ما
چو ماتا کہ اندر جہاں زندہ بود   بشادی و غم داشت شکر و ثنا

---

[1] دیوان ورق ۴۹ [2] دیوان ورق ۱۷۹ [3] دیوان ورق ۱۸۳ [4] دیوان ورق ۱۸۱ب - ۱۸۳

اگر مریم و رابعہ خوانمش   یقین دان کہ گفتم خطائی خطا
بقدر غم خویش اگر نی المثل   زمانی شویم اشکبار از بکا
بنوعی زند جوش طوفان آب   کہ دردی خورد نہ فلک غوطہ ہا
غم ما اگر چرخ را در دہد   فتد بر زمیں کوہ آسا ز پا
چو برق آہ ما گر درخشد در ابر   بود شعلہ را صد حذر از گیا
اگر کوہ اندوہ ما بشنود   نگوید بجز آہ گاہ صدا
سہ تا داشت فرزند جز من ولی   ہمیشہ مرا خواستی زاں سہ تا
اگر داشتی جان و دل صد ہزار   بیکبار بر من نمودی فدا
چو کردی مخاطب مرا آں زماں   زمی عمر گفتی دمی جان مرا
ز نطق آنچہ من با دلش کردمی   بکرد دست با غنچہ باد صبا
بچشمی کہ از گریہ کردم سفید   ز خاک مزارش کشم توتیا
رود گر بگلشن پی دفع غم   شود سنبلش افعی جاں گزا
زہم بگسلد جسم زارم چو تار   گرم در بر خویش گیرد قبا
بیاید دگر کاہ را بر گرفت   اگر افتدم سایۂ کہربا
ہر آہی کہ از سینۂ من جہد   چو عیسیٰ فراشد بفوق سما
ہر اشکی کہ از دیدۂ من چکید   چو قارون فروشد بتحت الثرا
بخواب اندرم نیم شب آمدہ   لب آہم پی گفت و گو کردہ وا
بگو بہر تاریخ من مصرعے   کہ ہم از احبا و ہم ز اقربا
یکی گویدت آفریں آفریں   یکی گویدت مرحبا مرحبا

چو گفتی تو تاریخ گفتم باد　　ز دار الفنا شد بدار البقا ۱۰۱۹ھ

چو بشنید این مصرع دلپسند　　ز شادیش بالید سر تا بپا

پس آنگہ سر و چشم بوسید و گفت　　ترا باد حافظ خدا و الدعا

۳- اس کا ایک بھائی ۱۰۳۹ھ میں جوان عمری میں مرا، اسکی موت پر یہ اشعار کہے تھے[1] :-

درد اکہ برادر عزیزم　　یکبار جگو نہ از جہاں رفت

تاریخ وفات او نوشتم　　افسوس کہ از جہاں جواں رفت ۱۰۳۹ھ

۴- نورس کی تین اولادیں تھیں، ان کے لیے فرزند کا لفظ استعمال کیا ہے، معلوم نہیں ان میں لڑکے کتنے تھے اور لڑکیوں کی تعداد کتنی تھی، شاعر نے تینوں کی تاریخ ولادت کا ذکر ایک قطعہ میں کیا ہے[2] ؛

حضرت دادار جہاں آفرین　　کردہ سہ فرزند عنایت مرا

سال ولادت ز پی ہر یکی　　خواستم از ہاتفِ مشکل کشا

زود ہماں لحظہ بگوش دلم　　گفت غنا و غنی و اغنیا

غنا سے ۱۰۵۱ھ، غنی سے ۱۰۶۰ھ اور اغنیا سے ۱۰۶۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اس سے واضح ہے کہ تینوں فرزندوں کی تاریخ پیدائش علی الترتیب یہی تھیں، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قطعہ تاریخ ۱۰۶۲ھ یا اس کے فوراً بعد کا ہوگا، تیسری اولاد کی پیدائش پر یہ قطعہ نظم کیا گیا ہوگا۔

۵- اپنے بھائی کے ترکے کے سلسلے میں اس کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا، وہ گجرات میں مقیم تھا اور کافی سرمایہ چھوڑ کر مرا تھا، دفعتاً اس کے انتقال پر لوگوں نے اسکی جائداد پر قبضہ مخالفانہ کرلیا، نورس نے قاضی وقت کی خدمت میں ایک منظوم قطعہ پیش کیا، اس سے جہاں اور کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں

[1] دیوان ورق ۳۰۸ - ۱۰۵ [2] ورق ۱۰۸

وہاں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ گجرات سے عازم وطن تھا، گو وطن کا معاملہ تشنہ چھوڑ دیا گیا ہے اس قطعہ کے ابیات یہ ہیں[1] :-

ای نائب محمد مرسل درین دیار　　شرع از تو روشن است چو از آفتاب ماہ

در خدمت تو مظلوم آید بصد نشاط　　زیرا کہ پیش تست برابر گدا و شاہ

بشنو خدای را نفس ماجرای من　　گر نشنوی تو پیش کہ گویم؟ چہ سازم؟ آہ

گجراتیاں کہ نیست بمن اختلاطشان　　گردند روز در نظر من چو شب سیاہ

بود از برادر من بسیار نقد و جنس　　از خرمنش بمن نرسیدہ بنیر کاہ

تسلیم می نمودندی بیش ازیں بعجز　　مبلغ ہزار ہوں بمن خانماں تباہ

راضی نگشتم و نگرفتم ہر دروغ نیست　　دارم ز فاضلان زمانہ دو کس گواہ

حالا چہ شد کہ چوں نروم من بنزد شاہ　　سوئیم نگہ کنند بسر کردہ کج کلاہ

بہر خدا معاملۂ من بخاطر آر　　بر حکم شرع مصطفوی کن مرا نگاہ

بپسند کز دیار تو سوی دیار خود　　من ناامید گشتہ گذارم قدم براہ

تا ماہ و سال ہست بگیتی نشستہ باد　　بر صدر شرع ذات شریعت بعز و جاہ

اس قطعہ سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ کچھ دنوں گجرات میں رہا ہوگا، مگر گجرات اس کا وطن نہ تھا، البتہ بھائی کے ترکے کی وجہ سے اس کو وہاں سے تعلق رکھنا پڑا ہوگا، گجرات کے لوگوں کے برتاؤ سے اس کو بڑی ناامیدی ہوئی، اس لیے وہ نہ گجرات کو پسند کرتا تھا اور نہ گجراتیوں کو جیسا کہ محمد عادل شاہ کے وزیر خواص کے ہجو یہ قطعہ سے واضح ہوتا ہے،

پادشاہا خواص خاں ماری است　　درجہ در کار و بار دنیائی

[1] دیوان ورق ۷۹/ ب

بارہا دیدہ ام نزدیکش
بہتر از شہر لیست صحرائی

بندۂ درگہ تو گرمانی
کو فلاطون بود بہ دانائی

منصبش دادہ گوجراتی را
کہ نداند نمد ز دارائی

ہر کہ می بیندش ہمی گوید
سگ تشستہ بجای کیپائی

خاندیس کے مقابلے میں گجرات کی جو حیثیت اس کے نزدیک تھی اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

سکونت دکن | علاوہ خارجی شہادت[1] کے جو بہت اجمالی ہے، خود نورس[2] کے دیوان سے اس امر کی پوری شہادت ملتی ہے کہ نورس کی عمر کا بڑا حصہ بیجاپور میں وہاں کے تین سلاطین یعنی ابراہیم ثانی، محمد اور علی ثانی کے تعلق سے گذرا، حسب ذیل ابیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

شہ آنکس[3] است بہ نزدم کہ چوں مسمی خلیل
تمام کشور توراں فراگرفت وگذاشت

رسد بہ میر[4] کہ از شاہ نورس ابراہیم الخ

پہلی بیت میں مسمی خلیل سے ابراہیم عادل شاہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں مراد لیا جاسکتا، دوسری بیت میں ابراہیم کے ساتھ شاہ نورس کے لقب سے سارے شبہات دور ہوجاتے ہیں پہلی بیت کی توثیق اس بیت سے بھی ہوجاتی ہے:

شہ عادل لقب[5] ہر لحظہ فرماید بسی شادم
کہ ہیچو مولوی احمد سخنور پیشوا دارم

اگرچہ "شہ عادل لقب" سے ابراہیم اور اس کا بیٹا محمد دونوں مراد ہوسکتے ہیں، لیکن اس بیت کی موجودگی میں "مسمی خلیل" سے مراد عادلشاہی ابراہیم کے علاوہ کوئی دوسرا سلطان نہیں ہوسکتا، البتہ مولوی احمد کی شخصیت کا تعین بحالت موجودہ ممکن نہیں

محمد عادل شاہ سے نورس کے تعلقات کا اندازہ حسب ذیل امور سے کیا جاسکتا ہے:

---

[1] یعنی ابراہیم زبیری مولف بساتین السلاطین کی شہادت [2] دیوان ورق ۱۸ [3] ورق ۱۰۵ [4] ورق ۶۲ ب

۱۔ اس نے خواص خاں کے قتل کا واقعہ نقل کیا ہے جو ۱۰۴۵ھ میں پیش آیا تھا، قطعہ[1] یہ ہے:

وزیر چوں خلاف شہنشہ خواص خاں
ریحان بہ تیغ ہیچو نریان سرش برید

تاریخ اے خرد چہ نویسیم مرا بگو
گفتا ہمیں نویس کہ ریحاں سرش برید ۱۰۴۵ھ

خواص خاں کا ریحاں کے ہاتھوں قتل محمد عادل شاہ کے عہد کا مشہور واقعہ ہے۔

۲۔ خواص خاں کے لیے نورس نے ایک ہجویہ قطعہ[2] لکھا تھا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے،

۳۔ پرندہ کے قلعہ کا مغلوں نے محاصرہ کیا تھا، لیکن ناکام ہوکر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوگئے تھے، نورس نے اس موقع پر ایک قطعہ[3] نظم کیا تھا جس کے آخری مصرع "تاریخ شد چنیں کہ "زمانہ خجل شدہ" سے اس واقعہ کی تاریخ ۱۰۴۵ھ نکلتی ہے، تاریخی کتب سے بھی اس واقعہ کی توثیق ہوتی ہے، اس سے اس زمانہ میں نورس کا قیام بیجاپور کسی مزید ثبوت کا محتاج نہیں رہ جاتا۔

محمد عادل شاہ کی وفات پر ایک قطعہ کہا[4] ہے، جو حسب ذیل ہے،

خاقان خداپرست ہمنام حبیب
کش بود بدوش تخت مسند دائم

بر تخت تشست ملک رانی کردی
بر حکم شریف شرع احمد دائم

می خواست ز عقل چوں مورخ نورس
تاریخ خدیو خلد مرقد دائم

من زود بدو بداں ہاتف گفتم
سلطان بہشتیاں محمد دائم

"سلطان بہشتیاں محمد دائم" سے ۱۰۶۵ھ تاریخ نکلتی ہے، حالانکہ بادشاہ کی وفات ۱۰۶۷ھ[5] میں ہوئی، معلوم نہیں یہ غلطی کس طرح ہوئی۔

---

[1] دیوان ورق ۱۸۰ [2] ورق ۸۰ ب [3] ورق ۱۷۹ [4] ورق ۱۸۰ [5] ورق ۷۶ ب [5] ابراہیم زبیری نے بساتین ص ۳۴۵ میں یہی تاریخ درج کی اور "عاقبت محمود محمد شد" سے اس کی توثیق کی ہے، لیکن تاریخ عادلشاہی مولفہ نوراللہ ص ۵۵ (طبع حیدرآباد ۱۹۶۴ء) میں وفات کی تاریخ ۲۹ محرم ۱۰۶۶ھ لفظوں میں درج ہے، میرے خیال میں ۱۰۶۲ھ کی جگہ ۱۰۶۷ھ ہونا چاہیے۔

علی عادلشاہ ثانی کی تخت نشینی پر اس نے دو رباعیاں لکھی تھیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تخت نشینی پر نورس بیجا پور میں مقیم تھا، وہ رباعیاں یہ ہیں،[۱]

تاب مہر حسن طلب افزای علی
آب گہر نطق طرب زای علی
بر تخت چو بنشست بدولت گفتم
تاریخ شہ گیتی آرای علی

زیبندۂ چتر و تخت و دیہیم علی
بخشندۂ گوہر و زر و سیم علی
تاریخ جلوسش ز خرد جستم گفت
شد بعد محمد شہ اقلیم علی

پہلی رباعی سے ۱۰۶۷ھ اور دوسری سے ۱۰۶۵ھ تاریخ نکلتی ہے، معلوم نہیں غلط فہمی کی بنیاد کیا ہے،

ورود خاندیس دیوان کے ایک شعر سے واضح ہوتا ہے کہ نورس دکن سے خاندیس گیا تھا، اگرچہ قطعی طور پر اس قیام کی نوعیت نہیں معلوم لیکن وہ مدت دراز تک دکن یعنی بیجاپور میں رہا،[۲] اس سے قیاس کیا گیا ہے کہ خاندیس میں اس کا قیام عارضی رہا ہوگا، اس کے باوجود علی عادلشاہ کے دور میں بیجاپور سے خاندیس منتقل ہونے کا قیاس پوری طرح واضح نہیں ہوتا، اور گجرات، دکن، خاندیس کے قیام کی تاریخی ترتیب پوری طرح واضح نہیں ہوتی، بہرحال حسب ذیل شعر[۳] سے قیام گجرات ثابت ہے،

نورس دگر از دکن بخاندیس
از بہر حسن محمد آمد

معلوم نہیں حسن محمد کون بزرگ تھے، جن کی کشش نورس کو دکن سے گجرات کھینچ لے گئی تھی،

---

[۱] ورق ۹۲ [۲] ورق ۹۲ ب، نور اللہ نے تاریخ علی عادلشاہی (ص ۵۸) میں حسب ذیل تین تاریخیں درج کی ہیں:

بہر سال جلوس شاہ دکن
گفت ہاتف سحر بصوت جلی
نیست آخر دریں سخن حرفی
جانشیں محمد است علی = ۱۰۶۷ھ، ۱۰۶۷ھ

نوبت شاہی زدہ بعد محمد علی

سال تاریخ جلوسش خواستم از عقل
گفت "امیر المومنین بعد محمد شد علی" [۳] ورق ۴۴ [؟]

حسب ذیل قطعے[۱] سے گجرات پر خاندیس کی فوقیت ظاہر ہوتی ہے:

جلال الانام افصحی آنکہ چرخ
زتیر و مہش دادہ کلک و دوات
ز رشک معانی و الفاظ او
تر و خشک گشتہ گلاب و نبات
ز دیوان رنگین او ہر غزل
بود تحفۂ شاعران ہرات
از و سر زدہ دی کہ در ہند نیست
چو گجرات خاندیس نیکو صفات
ز مہر و محبت کہ دیدم درو
ندیدم در آباد و در اجہات
ز سابرمتی زندگی یافتم
کہ ہست آب او ہمچو آب حیات
مرا از دوی آہستگی گفتمش
کہ اے عقل تو آگہ از کائنات
چہ نسبت بخاندیس گجرات را
کہ خاندیس دیس است و گجرات رات
بشادی ہزار آفریں کرد و گفت
خدا حارثت باد از حادثات

معلوم نہیں جلال الانام افصحی کون شاعر تھے، جن کا نشو و نما گجرات میں ہوا تھا اور جنھوں نے دریائے سابرمتی کے پانی میں آب حیات کی تاثیر پائی تھی، نہ اس شاعر کا ذکر کہیں ملتا ہے اور نہ اس کے کلام کا نمونہ دستیاب ہوتا ہے، نورس نے خاندیس اور گجرات میں وہی فرق پایا جو دن اور رات میں ہوتا ہے،

پیدایش اور عمر نورس کی پیدایش اور عمر کے بارے میں کسی خارجی ذرائع سے کسی اطلاع کی توقع نہیں کیجا سکتی، اس کے دیوان سے بھی اس سلسلہ میں کوئی خاص رہنمائی نہیں حاصل ہوتی، البتہ بعض امور ایسے ہیں جن سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے، اس کی والدہ کی وفات ۱۰۱۹ھ[۲] میں ہوئی، اس کے دیوان میں ایک قطعہ ہے، جس سے یہی تاریخ نکلتی ہے، ایک دوسرا

---

[۱] ورق ۸۳ ب [۲] ورق ۸۳ [؟]

قطعہ ۱۰۲۳ھ کا ہے جو کسی بزرگ عتیق اللہ کے روضہ کی تعمیر پر لکھا گیا ہے،[1] تیسرا قطعہ ۱۰۲۶ھ[2] کا معلوم ہوتا ہے جس میں عباس نامی کسی آدمی کے مرنے پر اس کی ہجو ہے، ان قطعات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ۱۰۱۹ھ میں وہ شاعری کرتا تھا، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی تیسری دہائی میں (یعنی ۲۰ - ۳۰ سال) ہوگا، اور اس کی پیدائش ۹۸۹ھ اور ۹۹۹ھ کے درمیان ہوئی ہوگی،

لیکن اس سلسلے میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی تین اولادوں کی تاریخ پیدائش ۱۰۵۱ھ، ۱۰۶۰ھ، اور ۱۰۶۲ھ لکھی ہے،[3] پہلی اولاد کی پیدائش کے وقت اسکی عمر کم سے کم ۵۲ سال، دوسرے کے وقت ۶۱ سال اور تیسرے کے موقع پر ۶۳ سال کی ہوگی۔ ۵۲ سال سے پہلے اولاد نہ ہونے کی توجیہ اس کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی شادی دیر میں ہوئی ہو، یا پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی ہو سب اولادیں دوسری بیوی سے ہوں، بہرحال یہ تقریباً مسلم ہے کہ نورس نے لمبی عمر پائی تھی، اسکے دیوان میں ایک قطعہ ہے جس سے ۱۰۶۹ھ[4] ہجری تاریخ نکلتی ہے، اگرچہ اس کے بعد بھی اس نے اشعار کہے ہوں گے، لیکن اگر اسی کو اس کا آخری منظومہ قرار دیا جائے تب بھی اس کی شاعری کی مدت پچاس سال سے زیادہ ہوتی ہے۔

مذہب | نورس سنی المذہب تھا، اور حضرت عبدالقادر جیلانی سے گہری عقیدت رکھتا تھا اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، بظاہر اس کا نام اس کے خاندان کی گہری عقیدت کی غمازی کرتا ہے، اس کے دیوان میں دو غزلیں ہیں جن سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے، مثلاً ملاحظہ ہو:

قبلۂ ما مستمندان کوی عبدالقادر است — کعبۂ ما دردمندان کوی عبدالقادر است

درد ما داروی شافی نشد داروی کس — داروی شافی آں داروی عبدالقادر است

ہر دو عالم را مشام جاں معطر جاوداں — از نسیم زلف مشکیں روی عبدالقادر است

---

[1] ورق ۹۲ ب [2] ورق ۱۸۸ [3] ایضاً [4] ورق ۸۲ ب [5] ورق ۱۸ الف

ہر کرامت از اتقیا و ہر کرامت از اولیا — روے او چو روز و شب موئے عبدالقادر است

تا ہمیشہ خاک روبد از جناب روضہ اش — ہر گہ دوں را بکف جاروی عبدالقادر است

بعد اصحاب کرام سرور پیغمبران — فتح دیں از قوت بازوی عبدالقادر است

از برای زاہداں محراب مسجد کردہ اند — نورسی محراب ما ابروی عبدالقادر است[5]

شاہنشہ بغداد کہ غوث الثقلین است — صد فخر از و ہم بحسن ہم بجبین است

نورس اثر سجدہ درگاہ رفیعش — ہر جبہہ ما موجب صد زینت و زین است

اس آخری بیت سے قیاس ہوتا ہے کہ نورس کو حضرت عبدالقادر جیلانی کے روضہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، (باقی)

ورق ۱۹ ب

فاتح ہند محمد بن قاسم ثقفیؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہندوستان کی ابتدائی اسلامی فتوحات میں طائف کے قبیلۂ بنو ثقیف کا بڑا حصہ ہے، خاص طور سے ان میں آل ابی العاصی ثقفی اور آل ابی عقیل ثقفی نے اس سلسلہ میں بڑا شاندار کارنامہ انجام دیا ہے، عہد فاروقی میں عثمان حکم، مغیرہ بنو ابی العاصی ثقفی رضی اللہ عنہم نے یہاں غزوات و فتوحات کی ابتدا کی، اور عہد اموی میں محمد بن قاسم ثقفی اور ان کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم نے شاندار فتوحات حاصل کیں، اور اس میں حجاج بن یوسف کی توجہ نے بڑا کام کیا، محمد بن قاسمؒ نے اپنی جوانی کے بہترین ایام یہاں کی فتوحات و غزوات کی نذر کر کے اس ملک کو اسلام کی دولت اور یقین و ایمان کی تازگی بخشی، اس اعتبار سے وہ تنہا "فاتح ہند" کے لقب کے مستحق ہیں، مگر افسوس ہے کہ اسلام کے اس عظیم فاتح کے حالات موجودہ تاریخوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں، صرف بلاذری اور یعقوبی میں کچھ روایات ملتی ہیں، مگر وہ اتنی مختصر و نامکمل ہیں کہ ان کو اس کی فہرست کہنا چاہیے، علی بن حامد کا فتح نامہ سندھ (چچ نامہ) بہت بعد کی تصنیف ہے، اس میں جو کچھ ہے محمد بن قاسم کی فتوحات کے متعلق ہے جس کا تعلق رزم سے ہے، واقدی کی کتاب اخبار فتوح بلد السند[۱] اور مدائنی کی کتاب ثغر الہند، کتاب عمال الہند اور کتاب فتح مکران[۲] میں محمد بن قاسم کی فتوحات کی طرح ان کے سوانح و حالات بھی رہے ہوں گے، مگر یہ کتابیں صفحۂ روزگار سے مٹ چکی ہیں اور صرف ان کے نام باقی رہ گئے ہیں۔

---

[۱] کتاب الذخائر والتحف ص ۱۹۶ [۲] کتاب الفہرست ص ۱۵۰

بعد کے تذکرہ نگاروں نے محمد بن قاسمؒ کے حالات جہاں تک مل سکے مرتب کیے، مگر ظاہر ہے کہ جب کسی شخصیت کے حالات ہی نہ ملتے ہوں تو اسکی جامع اور مفصل و مکمل سوانح عمری کیسے لکھی جاسکتی ہے؟ اس لیے محمد بن قاسمؒ کے سوانح پر بہت کم لکھا گیا ہے، اور ضرورت تھی کہ اس سلسلے میں تحقیق و جستجو جاری رکھی جائے، یہ مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں کوشش کی گئی ہے کہ محمد بن قاسمؒ کے بارے میں جتنے معلومات بھی مل سکیں جمع کر دیے جائیں، اس مضمون میں بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور محمد بن قاسمؒ کی شیراز و فارس کی نظامت و امارت، ہندوستان کی فتوحات کے وقت ان کی عمر اور ان کے صاحبزادے عمر بن محمد بن قاسم کے حالات پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے اور سندھ و ہند کی فتوحات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے، اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے،

نام و نسب اور خاندان | محمد بن قاسم ثقفی متوفی ۹۶ھ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابو عقیل بن مسعود بن عامر بن معتب بن مالک بن کعب بن عمرو بن سعد بن عوف بن قسی، قسی کا لقب ثقیف ہے، اس کی شہرت کی وجہ سے اصل نام دب گیا، اور اسی کی نسبت سے اس قبیلہ کے افراد بنو ثقیف کہلائے، بعد میں بنو ثقیف دو طبقوں میں منقسم ہو گئے، احلاف اور بنو مالک، محمد بن قاسم طبقۂ احلاف کی شاخ آل ابی عقیل سے تعلق رکھتے تھے،

احلاف میں اسلامی تاریخ میں سب سے پہلا نام حضرت معتب بن مالک بن کعب رضی اللہ عنہ کا ملتا ہے، جنہوں نے اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قبیلۂ ثقیف میں اسلام کا داعی و مبلغ بنا کر بھیجا، مگر بنو ثقیف نے دعوت اسلام پر لبیک کہنے کے بجائے حضرت معتبؓ کو شہید کر دیا[۱]،

ابو عقیل بن مسعود ثقفی کی اولاد میں اموی دور خلافت میں کئی نامور امراء و حکام اور مجاہدین

---

[۱] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶ و ۲۶۷، کتاب المعارف ص ۱۴۱

و فاتحین گذرے ہیں، ان کا پرپوتا حجاج بن یوسف بن حکم بن ابوعقیل ہے سیف بنی مروان کہلاتا ہے،
جس نے اپنی سیاسی بصیرت اور انتظامی قابلیت سے اموی دور خلافت کو چاند لگائے، اسی کے ساتھ
اپنے ظلم و ستم سے اپنی شہرت کو داغدار اور خلفا کی خوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اسکے
باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی اسلامی فتوحات اور یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں
اس کی بڑی خدمات ہیں، ابوعقیل کے دوسرے پرپوتے قاسم بن محمد بن حکم بن ابوعقیل ہیں جو اموی
دور میں بصرہ کے امیر و حاکم تھے، ان ہی کے صاحبزادے محمد بن قاسم ہیں، جو حجاج بن یوسف کے
بچازاد بھائی تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کی والدہ کا نام حبیبہ ہے[1]، چچ نامہ
میں ان کا لقب عماد الدین آیا ہے، مگر یہ ان کا اصلی لقب نہیں، بلکہ بعد کی ایجاد ہے، "الدین" کی
اضافت کے ساتھ لقب اختیار کرنے کا رواج چھٹی صدی سے ہوا اور امراء و سلاطین اور اعیان و اشراف نے اس نسبت
سے اپنے لیے بڑے بڑے القاب وضع کئے،

آپ کے والد قاسم بن محمد

آپ کے والد قاسم بن محمد بن حکم بصرہ کے امیر و حاکم تھے، ۷۵ھ میں
خلیفہ عبدالملک بن مروان نے جب حجاج بن یوسف کو عراق اور پورے مشرقی بلاد اسلامیہ
کا والی بنایا تو اس نے قاسم بن محمد کو اپنی طرف سے بصرہ کا امیر مقرر کیا، علامہ ابن حزم نے
جمہرۃ انساب العرب میں تصریح کی ہے:

والقاسم بن محمد بن الحکم بن ابی عقیل ولی البصرۃ للحجاج[2]	محمد بن قاسم ثقفی حجاج بن یوسف کے نائب کی حیثیت سے بصرہ کے امیر و حاکم تھے،

اسی طرح حجاج کے چچازاد بھائی یوسف بن عمر بن محمد بن حکم بن ابوعقیل نے ایک اور موقع
پر قاسم بن محمد کو بصرہ کا حاکم بنایا، اور وہ ۹۶ھ تک اس عہدہ پر رہے، علامہ بلاذری نے انساب الاشراف

۱؎ چچ نامہ ص ۱۹۲ ۲؎ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۷،

میں لکھا ہے کہ ۹۶ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کی موت کے بعد اہل بصرہ نے قاسم بن محمد کے
بجائے عبداللہ بن ابوعثمان بن عبداللہ بن امیہ بن عبداللہ بن خالد بن اسید کو اپنا امیر منتخب کرلیا، اور
قاسم بن محمد نے راہ فرار اختیار کرلی،

وھرب القاسم بن محمد الثقفی عامل یوسف بن عمر علیها[1]	اس وقت یوسف بن عمر کے عامل بصرہ قاسم ابن محمد ثقفی نے فرار اختیار کیا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد کے کام سے اہل بصرہ مطمئن نہیں تھے، اور پہلے ہی سے ان کے
ہٹانے کا منصوبہ رکھتے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی صاحب بصیرت آدمی نہیں
تھے، علامہ محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب "المحبر" میں حمقی ثقیف کی فہرست میں عبدالرحمن بن ام
الحکم (بن عبداللہ بن ربیعہ) اور مغیرہ بن عبداللہ بن ابوعقیل کے بعد قاسم بن محمد بن حکم بن ابوعقیل
کا نام بھی درج کیا ہے[2]،

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد اپنے خاندان سمیت اپنے صاحبزادے
محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان کی فتوحات میں شریک تھے، علی بن حامد کوفی اوشی نے
چچ نامہ میں حجاج بن یوسف کے ایک خط کا ترجمہ درج کیا ہے، جو محمد بن قاسم کے نام تھا
اس میں ہے کہ

"بزرگان کہ در لشکر تو اند، چوں بنو سلیم و بنو تمیم و مادر تو حبیبۃ العظمی، و برادر تو صلب
ابن قاسم، و عم تو، و پدر تو کم بنودہ اند"[3]

ہندوستان میں محمد بن قاسم کی فتوحات کا زمانہ ۹۲ھ سے ۹۶ھ تک ہے، اور معلوم ہو چکا
ہے کہ قاسم بن محمد ۹۶ھ تک حجاج اور یوسف کی طرف سے بصرہ کے امیر تھے، اسلیے ہندوستان

۱؎ انساب الاشراف جلد ۵ قسم ۲ ص ۱۵۳، طبع یروشلم ۲؎ کتاب المحبر ص ۳۸۰ ۳؎ چچ نامہ ص ۱۹۲

کی فتوحات میں ان کی شرکت دوران امارت میں کسی خاص وقت میں ہوئی ہوگی۔

حجاج کی دامادی کی کہانی

حضرت محمد بن قاسم حجاج بن یوسف کے چچا زاد بھائی تھے، یہ مسلمہ حقیقت ہے جس کا اظہار بھی کئی مورخوں نے کیا، مگر ان کا حجاج بن یوسف کا داماد ہونا مشتبہ ہے، اور مصنف چچ نامہ کے علاوہ کسی مورخ نے اس کی تصریح نہیں کی ہے، انساب و تذکرہ کی کتابوں میں حجاج بن یوسف کی اولاد میں اس کی کسی بڑی لڑکی کا نام تک نہیں ملتا ہے، چہ جائیکہ محمد بن قاسم سے رشتۂ مناکحت کا تذکرہ ہو، علامہ ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں حجاج کی اولاد کے یہ نام درج کئے ہیں (۱) محمد (۲) ابان (۳) عبدالملک (۴) ولید (۵) جاریہ (ایک لڑکی)[1] اور علامہ ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب میں ان کے یہ نام لکھے ہیں (۱) محمد (۲) عبدالملک (۳) ابان (۴) سلیمان[2]، اس میں ولید کے بجائے سلیمان ہے اور جاریہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس کے باوجود چچ نامہ میں ہے "محمد قاسم پسر عم او بود، و داماد نیز بود"[3] پھر اس سلسلہ میں ایک داستان درج ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حجاج بن یوسف نے خوش ہوکر محمد بن قاسم سے کہا کہ تم میرے سامنے اپنی کوئی تمنا پیش کرو، میں پوری کروں گا، محمد قاسم نے کہا کہ آپ مجھے بادشاہ بناکر اپنی بیٹی سے میری شادی کر دیں، یہ سنکر حجاج نے چھڑی سے محمد بن قاسم کے سر پر مارا جس سے ان کا عمامہ گر گیا، اور پھر وہی بات کہی جس کے جواب میں محمد بن قاسم نے اپنی وہی آرزو دہرائی، حجاج نے تیسری بار یہی کہا اور محمد بن قاسم نے پھر وہی جواب دیا، اس کے بعد حجاج نے کہا "بشرطے تر اوہم کہ چوں شاہ شوی بلشکر فارس و یا ہند بروی، و مال آں حاصل کنی، و آں نواحی را فتح کنی، و مضبوط گردانی"[4]۔

نوٹ: حجاج بن یوسف کے رعب داب اور غیظ و غضب اور محمد بن قاسم کی صغر سنی اور نجابت و [illegible]

[1] المعارف ص ۱۹۰، [2] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶، [3] چچ نامہ ص ۹۴، [4] ایضاً

سے اس قسم کی باتیں بہت بعید ہیں۔

شیراز و فارس کی نظامت و امارت

محمد بن قاسم کا بچپن ظاہر ہے کہ عراق اور بصرہ میں گذرا تھا جہاں انکے والد حدود ۷۵ھ سے ۹۶ھ تک حجاج اور یوسف بن عمر کی طرف سے امیر تھے، یہ زمانہ بنو ثقیف کے عروج کا تھا، بلاد اسلامیہ کی بڑی بڑی امارتوں پر ثقفی امرا و حکام مقرر تھے، اس لیے ان میں اثر و اقتدار، شان و شوکت، عزت و شرافت اور جود و سخا جیسے صفات پیدا ہوگئے تھے، اور انکی اولاد میں بھی یہ چیزیں تھیں، محمد بن قاسم بھی اسی فضا میں پروان چڑھے تھے، اس لیے عنفوان شباب ہی سے ان اوصاف میں مشہور اور سیاست و قیادت اور ملکی انتظام کے جوہر ان میں نمایاں ہوگئے تھے، اس لیے حجاج بن یوسف نے ان کو نو عمری ہی میں فارس اور شیراز کا امیر و حاکم بناکر روانہ کیا، اس کا متعین زمانہ نہ معلوم ہوسکا لیکن ہمارا خیال ہے کہ ۸۰ھ کے قریب کا واقعہ ہے، اس لیے کہ ۷۸ھ میں حجاج نے خوارج کو شکست دی، اس کے بعد سجستان، خراسان، کرمان اور فارس وغیرہ شرقی ممالک کے انتظامی امور و معاملات پر توجہ کی، اور ان کے بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کے لیے نئے امرا و حکام مقرر کیے، چنانچہ مہلب بن ابی صفرہ ازدی کو خراسان کا اور ابی بکرہ کو سجستان کا حاکم بنایا، اور اس کے دو سال کے بعد ۸۰ھ میں والی سجستان عبید اللہ ابن بکرہ کا انتقال ہوگیا تو حجاج نے ۸۱ھ میں مہلب بن ابی صفرہ کے بیٹے مغیرہ بن مہلب کو وہاں کے خراج اور صیغۂ مالیات کا امیر بنایا، مگر ۸۲ھ میں مغیرہ اور مہلب باپ بیٹے دونوں کا انتقال ہوگیا[1]، غالباً ۸۰ھ اور ۸۲ھ کی درمیانی مدت میں حجاج نے محمد بن قاسم کو فارس کے شہر شیراز کی جدید تعمیر و ترقی کا ناظم تعمیرات بنایا تھا، علامہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں شیراز کے ذکر میں لکھا ہے،

وهي مما استجد عمارتها واختطاطها   شیراز ان شہروں میں سے ہے جو اسلامی

[1] تاریخ طبری ج ۶ ص ۳۱۹

فی الاسلام قیل: اول من تو تی	دور میں دوبارہ آباد کیے گئے، اور جدید طرز
عمارتها محمد بن القاسم بن (محمد	پر پہلے سے اس کی تعمیر ہوئی، ایک قول کے
ابن الحکم بن ابی) عقیل ابن عم	مطابق محمد بن قاسم اس شہر کی جدید تعمیر
الحجاج (معجم البلدان ج ۵ ص ۳۲۰)	کے پہلے ناظم و متولی تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم میں بچپن ہی سے تعمیرات کا ذوق تھا، اور ان کے دور میں شیراز میں عربی اسلامی طرز تعمیر داخل ہوا، جو پہلے سے بھی ایرانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھا، محمد بن قاسم نے اس میں اسلامی فن تعمیر کو شامل کر کے شیراز کو حسن و شعر کا شہر بنا دیا، اس کے بعد ان کو فارس کا باقاعدہ حاکم بنایا گیا، علامہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ حضرت عطیہ بن سعد بن جنادہ عوفیؒ نے ابن اشعث کی تحریک میں شریک ہو کر حجاج بن یوسف کے ظلم و ستم کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور ابن اشعث کی شکست کے بعد فارس میں جاکر پناہ لی، اس وقت محمد بن قاسم ثقفی یہاں کے حاکم تھے، حجاج نے محمد بن قاسم کو ان کی گرفتاری اور تادیب کے بارے میں لکھا، انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی، ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں :-

وخرج عطیة مع ابن الاشعث	عطیہ نے ابن اشعث کے ساتھ حجاج کے خلاف
علی الحجاج، فلما انهزم جیش ابن	خروج کیا، اور جب ابن اشعث کی فوج شکست
الاشعث هرب عطیة الی فارس	کھا گئی تو عطیہ فارس کی طرف بھاگ گئے، حجاج
فکتب الحجاج محمد بن القاسم الثقفی	نے محمد بن قاسم ثقفی کو لکھا کہ ان کو گرفتار کر
ان ادع عطیة فان لعن علی بن ابی	اگر وہ علی بن ابی طالب پر لعن طعن کریں تو خیر
طالب والا فاضربه اربعمائة	ورنہ ان کو چار سو درے مار کر سر اور داڑھی کے
سوط واحلق رأسه ولحیته	بال منڈوا دو،

اس حکم کی تعمیل میں محمد بن قاسم نے حضرت عطیہؒ کو گرفتار کیا اور حجاج کا خط سنایا، مگر عطیہؒ نے حضرت علیؓ پر طعن کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے محمد بن قاسم نے چار سو درے لگوا کر سر اور داڑھی کے بال منڈوا دیے[1]،

ابن اشعث اور حجاج کی فوجوں میں کئی سخت معرکے ہوئے، آخری معرکہ ۸۳ھ میں مقام مسکن میں ہوا جس میں ابن اشعث کو شکست ہو گئی اور ان کے آدمی مختلف ملکوں میں جاکر پناہ گزین ہو گئے، کچھ لوگوں نے دوسرے انداز میں مقابلہ جاری رکھا، اسی واقعہ مسکن کے بعد ۸۳ھ میں عطیہ فارس گئے اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں سزایاب ہوئے، حضرت عطیہؓ اس واقعہ کے بعد بھی فارس میں رہے، جب قتیبہ بن مسلم باہلی خراسان کا امیر ہوا تو وہاں چلے گئے، اور ۱۰۲ھ میں جب عمر بن ہبیرہ فزاری عراق کا امیر ہوا تو اس کی اجازت سے کوفہ میں آکر مقیم ہو گئے، اور وہیں ۱۱۱ھ میں انتقال فرمایا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان کی فتوحات میں شرکت کی اور اسلامی فوج کی کمان سنبھالی، چچ نامہ میں ہے :-

"پس چوں از ارمائیل رواں شد، صاحب (مصعب) بن عبدالرحمن را المقدمہ لشکر کرد، و جہم بن زحر الجعفی را ساقہ الشکر کرد، و عطیہ بن سعد عوفی را در میمنہ نصب کرد، و موسیٰ بن سنان بن سلمہ الہذلی را المیسرہ گماشت"[2]

محمد بن قاسم کے فارس میں امیر و حاکم ہونے کی ان دو تصریحات کے علاوہ تیسری تصریح علامہ بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے،

وکان محمد بفارس وقد امره ان	محمد بن قاسم جن دنوں فارس میں تھے، حجاج
یسیر الی الری وعلی مقدمته	نے ان کو حکم دیا کہ وہ ابو الاسود جہم بن زحر جعفی

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۱۳ طبع بیروت [2] چچ نامہ ص ۱۰۲

ابو الاسود جهم بن زحر الجعفي فردّه
اليه وعقد له على ثغر الهند وامره
ان يقيم بشيراز حتى يتتام اليه
اصحابه ويوافيه ما عدله[1]

کو مقدمۃ الجیش کا امیر بنا کر رے کی مہم پر
روانہ ہوں، لیکن پھر انکو روک کر اپنے پاس
بلا لیا، اور ہندوستان کی سرحد پر مامور کیا اور
یہ ہدایت کی کہ وہ شیراز میں اس وقت تک ٹھہرے
رہیں جب تک انکے پاس پوری فوج اور
جنگ کا ضروری سامان نہ پہنچ جائے۔

اس امارت کی سب سے بڑی شہادت خود محمد بن قاسم کے وہ اشعار ہیں جو انھوں نے اپنی گرفتاری کے بعد واسط کے قید خانہ میں کہے تھے، اور جن میں قید کی تیرہ و تار گھڑیوں میں فارس کی امارت کے تابناک ایام کی یاد سے تسلی دی ہے، اور اپنی مجاہدانہ و فاتحانہ اولوالعزمیوں کو یاد کرکے مایوس کن حالات کا بہادرانہ مقابلہ کیا ہے، وہ اشعار یہ ہیں:

فلئن ثويت بواسط دبارضها رهن الحديد مكبلا مغلولا

(اگر میں آج سرزمین واسط میں لوہے کی زنجیروں میں ڈوبا ہوا ہوں اور بیڑیوں سے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں تو کوئی غم نہیں ہے

فلرب فتية فارس قد رعتها ولرب قرن قد تركت قتيلا[2]

(کیونکہ میں نے فارس میں بہت سے مردوں کو لرزہ براندام کیا ہے، اور کتنے ہی بہادروں کو قتل کرکے چھوڑ دیا ہے)

غرض محمد بن قاسم نے حدود ۸۳ھ سے حدود ۹۳ھ تک شیراز اور فارس کی امارت کے تقریباً دس سالہ دور میں نوعمری کے باوجود بڑی شاندار خدمات انجام دیں، شیراز کو اسلامی طرز تعمیر پر دوبارہ آباد کیا، فوجی قیادت اور ملکی سیاست میں بڑی قابلیت کا ثبوت دیا، فارس میں فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور رے کی جنگی مہم پر روانہ ہو رہے تھے کہ ہندوستان کی مہم پر روانگی

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۴ [2] ایضاً ص ۴۲۸

کا حکم ملا، اور اسلامی فتوحات کا دھارا رے کے بجائے ہندوستان کی طرف مڑ گیا، جس کی تفصیل یہ ہے۔

ہندوستان کی امارت و فتوحات

خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۶ھ، ۸۶ھ) کے آخری دور خلافت (غالباً حدود ۸۰ھ) میں حجاج نے محمد بن ہارون نمری کو سندھ کا امیر مقرر کیا، ان کے زمانہ میں سرندیپ کے راجہ نے ایک جہاز عراق روانہ کیا جس میں ہدایا و تحائف کے علاوہ کچھ مسلمان عورتیں بھی تھیں، جن کے باپ دادا سرندیپ میں بود و باش رکھتے تھے، اور وہاں ان کا انتقال ہو گیا تھا، یہ جہاز دیبل (سندھ) کے سامنے سے گذرا تو یہاں کے سمندری ڈاکوؤں نے اسے لوٹا، اور عورتوں کو گرفتار کر لیا، حجاج کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے راجہ داہر کو ان عورتوں کی رہائی کے بارے میں لکھا، راجہ نے اس سے مجبوری ظاہر کر دی، اس وقت حجاج نے عبید اللہ بن نبہان سلمی کو فوج کشی کرنے کا حکم دیا، چنانچہ وہ فوج لیکر دیبل پہنچے، راجہ دیبل نے مقابلہ کیا جس میں عبید اللہ اور دوسرے مجاہدین شہید ہوئے، اس کے بعد حجاج نے عمان میں بدیل بن طہفہ بجلی کو دیبل بھیجا وہ بھی شہید ہو گئے،[1] ان دونوں حادثوں کا حجاج کو بہت رنج ہوا، اور اس نے آخری فیصلہ کن جنگ کے لیے محمد بن قاسم کو ہندوستان کا امیر مقرر کیا، وہ اس وقت فارس کی مہمات میں مصروف تھے، اور ہندوستان میں تقرری کا پروانہ اس وقت ملا جب وہ حجاج ہی کے حکم سے رے کی مہم پر نکل رہے تھے، اس حکم پر وہ ہندوستان کی مہم پر روانہ ہو گئے، طبری نے لکھا ہے کہ ۹۰ھ میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو قتل کیا،[2] یعقوبی کا بیان ہے کہ حجاج نے محمد بن قاسم کو ۹۲ھ میں سندھ پر مامور کیا، مگر ضروری انتظامات کے سلسلے میں وہ چھ مہینے تک شیراز میں مقیم رہے،[3] ہندوستان کی فتوحات کا آغاز عام مورخوں نے ۹۳ھ سے کیا ہے، چنانچہ ابن قتیبہ نے کتاب المعارف[4] میں، امام ذہبی نے العبر میں[5]، امام ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ۹۳ھ ہی میں لکھا ہے،[6] بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۳ [2] تاریخ طبری ج ۷ ص ۲۴۲ [3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۴۵ [4] کتاب المعارف ص ۱۴۴، [5] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۱۰۶ و ۱۱۴ [6] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۸۱

اس کا سلسلہ ۸۹ھ میں شروع ہو چکا تھا، جو ۹۶ھ میں ختم ہوا، ہمارا خیال ہے کہ ۹۰ھ میں محمد بن قاسم کا سندھ پر تقرر ہو چکا تھا، مگر چھ مہینہ تک وہ شیراز میں ضروری انتظامات میں مشغول رہے، پھر وہاں سے مکران آئے، یہاں بھی ان کو کچھ دنوں ٹھہرنا پڑا، پھر آگے بڑھے، اس طرح ۹۲ھ میں باقاعدہ مجاہدانہ سرگرمی شروع ہوئی، اور ۹۳ھ میں فتوحات کے سیل نے سندھ اور ہندوستان کے علاقوں کو گھیر لیا۔

محمد بن قاسم اسلامی فوج لیکر شیراز سے مکران آئے، کچھ دن یہاں ٹھہر کر انتظامات مکمل کیے، پھر قنزپور، ارمائیل، دیبل اور نیرون کو فتح کیا، اس سے فراغت کے بعد ایک مہم سدوسان روانہ کی جس نے اسکو فتح کیا، اس کے بعد علاقہ کچھ میں آئے جہاں راجہ داہر کے مقابلہ میں فتح پائی، اس کے بعد راور، برہمن آباد، الرور، بغرور، ساوندری، بسمد اور سکہ کو فتح کر کے دریائے سندھ کو عبور کیا، اور ملتان کو فتح کیا، یعقوبی نے لکھا ہے کہ دیبل کی فتح کے بعد سندھ کے تمام علاقے خود بخود محمد بن قاسم کے مطیع ہو گئے، نیرون کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے حجاج سے آگے بڑھنے کی اجازت طلب کی، اس نے لکھا کہ تمھارے تمام مفتوحہ علاقوں پر تمھاری حکومت ہوگی، اور خراسان کے حاکم قتیبہ بن مسلم باہلی کو لکھا کہ تم دونوں میں سے جو بھی حدود چین تک فتح کرلے گا وہ اس کا حاکم ہوگا، اس کے بعد محمد ابن قاسم نے اپنی جنگی مہم اور تیز کردی اور کئی نئے علاقے فتح کیے، اسی اثنا میں حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ میں نے خلیفہ ولید سے جو وعدہ کیا ہے کہ ہندوستان کی مہم پر جس قدر دولت صرف ہوگی اتنی دولت میں بیت المال میں داخل کر دوں گا، اس لیے اس وعدہ کو پورا کراؤ، محمد بن قاسم کو یہ خط ملا تو انھوں نے اخراجات سے زیادہ رقم روانہ کر دی۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۴۵)

بلاذری کا بیان ہے کہ حجاج نے ہندوستان کی فتوحات پر خرچ ہونے والی اور یہاں سے حاصل ہونے والی رقم کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ چھ کروڑ درہم خرچ ہوئے اور بارہ کروڑ درہم کی آمدنی ہوئی، اس آمد و خرچ پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے حجاج نے لکھا:

شفینا غیظنا، وادرکنا ثارنا،	ہم نے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے خوں بہا
وازددنا ستین الف الف درہم	کو پالیا، اور بارہ کروڑ درہم اور راجہ کا سر
ورأس داہر[1]	نفع میں پایا۔

اس کے بعد رمضان ۹۵ھ میں حجاج کا انتقال ہو گیا، اس وقت محمد بن قاسم ملتان میں مقیم تھے، اس واقعہ کی خبر پاکر وہ الرور، بغرور آگئے، اور بیلمان اور سرست میں فوجی مہم بھیجی جو کامیاب رہی اور خود کیرج گئے اور راجہ داہر کے بیٹے راجہ دوہر کے مقابلہ میں مظفر و منصور ہوئے، اسی دوران میں ۹۶ھ میں خلیفہ ولید کا انتقال ہو گیا اور سلیمان عبدالملک خلیفہ ہوا، اس کے حکم پر محمد بن قاسم کو سندھ سے گرفتار کر کے عراق پہنچایا گیا، اور واسط کے قید خانہ میں انواع و اقسام کی تکلیفیں دیکر مار ڈالا گیا، اس کی تفصیل آیندہ بیان کی جائے گی۔

ہندوستان کی فتوحات کے وقت محمد بن قاسم کی عمر — تقریباً تمام مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کی امارت و فتوحات کے وقت محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ [۱۷] سال کی تھی، مگر یعقوبی نے پندرہ سال بتائی، اور بلاذری نے کوئی تصریح تو نہیں کی ہے مگر ان کی وفات پر جو اشعار نقل کیے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سترہ سال کے قائل ہیں، یعقوبی نے لکھا ہے:

وکان لمحمد بن القاسم فی الوقت الذی	جس زمانہ میں محمد بن قاسم نے سندھ اور ہند کے
غزا فیہ بلاد السند والهند وقاد الجیوش	شہروں میں جہاد کیا اور افواج کی قیادت کی اور
وفتح الفتوح خمس عشرۃ سنۃ[2]	فتوحات حاصل کیں انکی عمر پندرہ سال کی تھی۔

اور اس کے ثبوت میں یہ اشعار نقل کیے ہیں، اور جن کو زیاد الاعجم کی طرف منسوب کیا ہے:۔

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۷ [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۴۴

ان المروءة والسماحة والندیٰ — لمحمد بن القاسم بن محمد

قاد الجیوش لخمس عشرة حجة — یا قرب ذلک سؤددا من مولد

لیکن فتوح البلدان اور چچ نامہ میں حمزہ بن بیض حنفی کے بتائے گئے ہیں، اور ان میں "لخمس عشرۃ حجۃ" کے بجائے "لسبع عشرۃ حجۃ" ہے۔

امام ابن حزم نے لکھا ہے:

محمد بن القاسم الذی فتح بلاد الهند وله سبع عشرة سنة[1] — محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں بلاد ہند کو فتح کیا،

علامہ ابن کثیر کا بیان ہے:

وافتتح محمد بن قاسم - وهو ابن عم الحجاج بن یوسف، مدینة الدیبل وغیرها من بلاد الهند، وکان قد ولاه الحجاج غزو الهند وعمره سبع عشرة سنوات[2] — حجاج بن یوسف کے چچازاد بھائی محمد بن قاسم نے دیبل اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کو فتح کیا اور حجاج نے ان کو ہندوستان کے جہاد پر مقرر کیا تھا، اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی،

چچ نامہ میں ہے کہ "اورا بولایت ہند نصب کرد، ہنوز در سن ہفدہ سالگی بود، وبجہت تہنیت آن امارت، حمزہ بن بیض الحنفی این شعر گفت[3]"، اس کے بعد مذکورہ بالا دونوں اشعار درج ہیں۔

اس سلسلہ میں کسی شاعر کا ایک شعر بلاذری نے نقل کیا ہے:

ساس الرجال لسبع عشرة حجة — ولداته عن ذاک فی اشغال

---

[1] جمهرة انساب العرب ص ۳۰۸، [2] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۸۷

یہ اشعار محمد بن قاسم کی تہنیت یا مرثیہ میں کہے گئے ہیں، اس میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ ہندوستان کی فتوحات کے وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی اشعار کو دیکھ کر مورخوں نے ان کی یہ عمر ہندوستان میں فتوحات کے وقت سمجھ لی، حالانکہ ان اشعار میں شیراز اور فارس کی امارت اور فتوحات کے وقت کی عمر کا ذکر ہے، اور شعراء نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی نوعمری اور نوخیزی میں ان کے حربی و سیاسی کارناموں کو سراہا ہے، اگر ۹۳ھ ہی کو ہندوستان میں فتوحات کا زمانہ مان کر اس وقت محمد بن قاسم کی عمر سترہ سال کی مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فارس کی امارت کے زمانہ میں جس کا زمانہ ۸۳ھ ہی مان لیا جائے ان کی عمر صرف سات سال کی ہوگی، جو ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ فارس کی امارت کے وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی، اور ہندوستان کی امارت کے وقت کم از کم ستائیس ۲۷ سال، سترہ سال کی عمر میں ان کی سماحت و شرافت، جود و سخا اور قیادت و سیاست کا جو تذکرہ پایا جاتا ہے، اس کا تعلق شیراز اور فارس کے زمانۂ امارت و قیادت سے ہے نہ کہ ہندوستان سے، خود محمد بن قاسم نے اپنے ایک شعر میں غنیۃ فارس (بہادران ایران) کو شکست دینے کا فخریہ انداز میں اظہار کیا ہے، اور ہندوستان آنے سے پہلے وہ رے کی مہم پر روانہ ہونے والے تھے، اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ان کی شاندار فتوحات کے مقابلہ میں ہمارے مورخوں نے ان کے شیراز و فارس کے کارناموں پر مطلق توجہ نہیں کی اور اس دور کی نوعمری کو بھی ہندوستان کی امارت کی زینت بنا دیا،

(باقی)

سعیدیہ کتب خانے کے نادر مخطوطات

از صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب ایم اے، آر او آر ایس ناظم ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

ہندوستان میں تاریخی دستاویزات اور مخطوطات کی اہمیت روز افزوں بڑھتی جارہی ہے، پروفیسر سرجادوناتھ سرکار نے تو اپنی تمام تحقیقات کا ذریعہ آرکائوز (Archives) اور مخطوطات (Manuscripts) ہی کو بنایا ہے، آجکل ان ہی مآخذ کے ذریعہ تحقیق و تنقید ہورہی ہے، ٹونک میں بھی مخطوطات کا ایک گرانمایہ ذخیرہ موجود ہے، یہ ذخیرہ ٹونک کے سعیدیہ کتب خانے میں محفوظ ہے، جس کا تذکرہ معارف میں پہلے بھی آچکا ہے، اس مقالے میں اسی ذخیرے کے تاریخی مخطوطات کا تعارف مقصود ہے، اس فن میں یوں تو سیکڑوں مخطوطات ہیں، مگر چند کتابیں نادر الوجود ہیں، اور بعض تو اتنی نایاب اور انمول ہیں جو اس ذخیرہ کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں ہوسکتیں اکبرنامہ تورک جہانگیری، عالم آرائے عباسی، سیر المتاخرین، طبقات اکبر شاہی وغیرہ اس ذخیرہ کے اہم نسخے ہیں اگرچہ یہ بہت سے کتب خانوں میں موجود ہیں اور ان کے تراجم بھی ہوچکے ہیں، اس لیے ان کا ذکر کرنا زیادہ مفید نہیں، البتہ شاہجہاں نامہ اس لیے اہم ہے کہ اس کا ترجمہ ابتک نہیں ہوا ہے، صرف چند اوراق کا الیٹ نے ترجمہ کیا ہے، دوسرے ہمارے ہاں کا نسخہ قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ خطاطی کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ اقبال نامہ جہانگیری کا بہت ہی نفیس نسخہ ہے جس پر اعلیٰ درجہ کا طلائی کام ہے، پہلے دو صفحوں کے بین السطور مطلا و مذہب ہیں، پورا نسخہ مینا کاری اور طلائی کام سے مزین اور خطاطی کا بھی اعلیٰ نمونہ ہے، گو اس کی کتابت چونتیسویں جلوس شاہ عالم

میں ہوئی لیکن مذکورہ بالا خصوصیات کی وجہ سے قابل قدر نسخہ ہے،

ان نسخوں کے ساتھ ایک اور اہم گر نامعلوم الاسم نسخہ بھی ہے جو دیکھنے سے کسی کتاب کا حصہ معلوم ہوتا ہے، کتابت اور طرز تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے کا نوشتہ ہے، اس میں مصنف اور کاتب کسی کا نام نہیں ہے، لیکن جگہ جگہ اورنگ زیب کا ذکر اور اس کے واقعات ہیں، ممکن ہے کہ فتوحات عالمگیری مصنفہ ایسر داس اور رائے بندرابن کی لب التواریخ کا حصہ ہو، جو انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے، اس نسخے کی کاپی مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نے حاصل کی ہے، جس کی نقل راجستھان یونیورسٹی لائبریری نے بھی لی ہے، ابھی تک اس نسخے سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکا، بہرحال یہ نسخہ قدیم اور نایاب ہے، آیندہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جائے گا،

۱۔ **اغراض السیاستہ** ۔ یہ ایک فارسی مخطوطہ ہے جس میں تاریخ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے، مگر طرز کتابت اور کاغذ کی ساخت سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم نسخہ ہے، محمد بن علی محمد بن الحسن الظہری الکاتب سمرقندی اس کے مصنف ہیں، جو خراسان کے بادشاہ سلطان سنجر بن ملک کے عہد کے مشہور مصنف تھے، اس کتاب میں سیاسیات و مدنیات سے متعلق جمشید ملک (۱۰۰۰ سال قبل مسیح) سے لیکر سنجر بن ملک (۱۰۹۲ء تا ۱۱۵۷ء) تک بادشاہوں اور خلفاء کے اقوال جمع کیے گئے ہیں، کیمبرج یونیورسٹی لندن کے محقق مسٹر رابرٹ نے جب وہ ٹونک آئے تھے اس نسخہ کو دیکھکر بہت پسند کیا تھا، اور اس کی نقل منگوائی تھی جس کا مائیکروفلم ان کو بھیجا گیا تھا،

۲۔ **البدایہ والنہایہ** ۔ امام حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی (۷۰۱ھ ۔ ۷۷۴ھ) کی مشہور تصنیف اور اسلامی تاریخ پر مستند اور ضخیم کتاب ہے، جس کی متعدد جلدیں ہیں، اور چھپ کر شائع ہوچکی ہے، ہمارے ہاں اس کی صرف ایک جلد ہے، اس میں

اخبارہ صلعم عن الغیوب المستقبلہ سے لیکر حضرت علیؓ کی شہادت تک کے واقعات ہیں، کاتب
کا نام نصیر بن شہید اور سنہ کتابت ۲۵۰ھ ہے، اس لحاظ سے یہ نسخہ بہت اہم، قدیم بخط
عربی خط سے مزین اور خطاطی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، شروع کے دو صفحے مجدول اور طلائی ہیں،
آخر میں دو مہریں ثبت ہیں، ایک مہر مختار الدولہ کی ہے، (ٹونک کے ممتاز جرنیل اور اہم رکن تھے)
اور دوسری نواب محمد علی خاں بانی کتب خانہ ہذا کی۔

۳۔ **تاریخ ابن حجر** ۔ حافظ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن محمد المعروف بہ ابن حجر عسقلانی
کی مشہور تصنیف کا حصہ دوم ہے جو آٹھویں یا نویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے، کاغذ کی ساخت
اور قدیم عربی رسم الخط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخہ یقیناً قدیم ہے۔

۴۔ **مرأت آفتاب نما** ۔ نواب عبدالرحمن ملقب بہ شاہ نواز خاں ہاشمی دہلوی، شاہ عالم
بادشاہ (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) کی چہیتی بیٹی کے استاد تھے، جو بعد میں شاہی محلات کے منتظم اعلیٰ بنائے گئے
مرأت آفتاب نما ان کی مصنفہ اور شاہ عالم کے سنہ جلوس ۴۵ تک کی مفصل تاریخ اور ایک طرح
کی سوانح بھی ہے، اور جغرافیہ بھی[۱]، یہ کتاب ایک مقدمہ دو جلوے اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے،
ہر جلوہ کو چند تجلیوں اور ہر تجلی کو چند لمعوں پر منقسم کیا گیا ہے، اس کتاب میں انبیاء، صحابہ، اولیائے کرام
علماء، حکماء، اطباء، شعراء، ادباء، امراء اور سلاطین وغیرہم کا ذکر بڑے دلچسپ اور رنگین
انداز میں کیا گیا ہے، اس طرح یہ تاریخ بھی ہے اور مشاہیر سخنوروں، باکمال اکابر اور ممتاز
سلاطین و امراء کا تذکرہ بھی، اس کے علاوہ اس میں بہت سے عجائب و غرائب اور نوادر کا بھی
مختصر ذکر ہے۔

کتاب کا نام شاہ عالم کے تخلص "آفتاب" کی مناسبت سے ہے، اور جیسا کہ مقدمہ میں

۱؎ دیکھئے اسٹوری ص ۱۲۶

مصنف نے بتایا ہے مرأت آفتاب نما تاریخی مادہ بھی ہے، نسخہ شاہ عالم کے دور کی بہترین
جامع اور مکمل تاریخ ہے، اس کے مختلف نسخے بعض مشہور کتب خانوں میں محفوظ ہیں، مگر بہت کم
مکمل ہیں، برٹش میوزیم کا نسخہ ناقص ہے جو صرف چند حصص پر مشتمل ہے[۱]، انڈیا آفس لائبریری لندن میں
اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء محفوظ ہے، ایلیٹ نے اپنی کتاب میں
۳۳۲ - ۳۳۳ صفحہ تک اس کا ذکر کیا ہے، ہمارے ہاں کا نسخہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۴ء
کا مکتوبہ ہے، بہت عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب فارسی نستعلیق خط میں ہے، اور اس پر نواب محمد علی خاں
جنت آرامگاہ کے دستخط بھی ثبت ہیں[۲]۔

۵۔ **جغرافیۂ عالم** ۔ یہ کتاب بھی نادر نسخوں میں ہے، کاغذ سفید مجدول شنجرفی، نہایت خوشخط،
اس مخطوطہ میں تقسیم اقالیم کا ذکر، صوبہ جات ہند کی تفصیل اور مغلیہ عہد کی تاریخی عمارتوں کا حال
اور ان کے مصارف کا بیان ہے، تاج محل اور اس کے مصارف کا کسی قدر تفصیلی حال ہے،
کتاب کے آخری صفحہ میں اکبر کی وفات اور سکندرہ کی تعمیر کا تذکرہ بھی ملتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ یہ کتاب اکبری دور کے اواخر میں لکھی جا چکی تھی، اکبر کے انتقال کے بعد کسی نے اس کی تاریخ وفات
اور سکندرہ کی تعمیر کا اضافہ کیا ہے، کاغذ کی ساخت، فارسی خط اور طرز تحریر سے گمان
ہوتا ہے کہ یہ اکبر اعظم کے عہد کا نوشتہ ہے، ترقیمے میں تاریخ کتابت وغیرہ کچھ نہیں ہے۔

۶۔ **تاریخ قلعۂ رنتھمبور** ۔ یہ غیر مطبوعہ اور نہایت ہی اہم تاریخی مخطوطہ ہے، جہاں تک
پتہ چل سکا ہے، کتب خانہ سعیدیہ کے علاوہ اور کہیں اس کا وجود نہیں ہے، راجستھان کی

۱؎ Rieu 131b (896 a)
۲؎ History of India as Told by its own Historians by Elliot & Dowson Vol VIII P.P. 332-333
مزید ملاحظہ کیجئے اورینٹل کالج میگزین جلد دوم ۳ بابت ماہ ۱۹۲۶ء ص ۵۹
۳؎ مولانا محمد عمران خاں فہرست نمبر ۱۱

تاریخ پر یہ اہم ترین کتاب ہے، راجستھان کے تمام مورخین اور محققین نے اس کو بہت اہم تسلیم کیا ہے، کیونکہ یہ ہندی کی تاریخی کتاب "راؤ ہمیر دیو والی رنتھمبور" کے حالات کا فارسی ترجمہ ہے، مصنف نے اپنا نام اور سنہ تصنیف نہیں دیا ہے، خط فارسی شکستہ ہے، شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو پانچ داستانوں پر تقسیم کیا ہے، پانچوں حصوں میں راجپوتوں کی نسل، ان کی شجاعت، دلیری اور راجہ ہمیر دیو اور علاء الدین خلجی کے مجادلے کے حالات و واقعات ہیں، قرونِ وسطیٰ میں قلعۂ رنتھمبور نہایت ہی اہم اور ناقابل تسخیر جنگی قلعہ مانا جاتا تھا، جس کی ایک پوری تاریخ، ایک داستان اور ایک راجپوتی آن بان تھی، راجستھان کا دل اور دلیر راجپوتوں کا مسکن یہی تاریخی قلعہ تھا، یہاں علاء الدین خلجی کی فوجوں نے راجپوتی آن بان کے مظاہر دیکھے تھے، ہمیر دیو اور علاء الدین کے جنگجو عساکر نے خون کی ہولیاں کھیلی تھیں، اور یہیں ستی پر مر مٹنے والی بہادر رانیوں نے قربانی کا سبق سکھایا تھا، یہ کتاب اسی تاریخی قلعہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے، جو اس کی تاریخ بھی ہے اور راجپوت شجاعت کی داستان بھی، اور خون آشام لڑائیوں کا مرقع بھی، گو اسکی تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا لیکن سمت ۱۸۱۵ سنہ بکرماجیت سے پہلے کی نوشتہ ہے، اس لیے کہ آخر کے آٹھ صفحات ہرآنند ناگوری کے نوشتہ ہیں، جو سمت ۱۸۱۵ سنہ میں بطور تتمہ بڑھائے گئے ہیں، ان صفحات میں بتایا گیا ہے کہ یہ قلعہ کس طرح اکبر اعظم کے قبضہ میں آیا، اور پھر آخر میں مادھو سنگھ جی والیِ جے پور کی حکومت میں کس طرح شامل ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا اصلی نسخہ تھا، جو کسی وجہ سے صاف نہیں ہو سکا، اور اس قلعہ کے قلعدار منشی ہرآنند کے پاس کسی طرح آ گیا، جس نے یہ چند صفحے اپنے قلم سے بڑھا دیے، کتاب کے بیشتر صفحات پر ناگری خط میں حواشی بھی ہیں،[1]

[1] اس کتاب کو اہم جانتے ہوئے ڈاکٹر متھرا لال جی اڈیٹر ہسٹاریکل جرنل اور جے پور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے انگریزی میں اسکو ترجمہ کرنے کے لیے مجھے خدمت سونپی ہے اور راقم الحروف اسکا انگریزی میں ترجمہ کر رہا ہے، جو اسی جرنل میں شائع ہوگا۔

۷۔ **تاریخ راجستھان**۔ تاریخ راجستھان الموسوم بہ نسب الانساب مصنفہ کالی رام کایستھ ساکن اجمیر، بہ زبان فارسی تاریخ راجستھان کا نہایت بیش بہا اور نایاب نسخہ ہے، جہاں تک پتہ چل سکا ہے، اس کا دوسرا نسخہ اس لائبریری کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں ہوتا، اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، یہ نسخہ بھی مورخ کے قلم کا اصلی نسخہ معلوم ہوتا ہے، خط پختہ شکستہ ہے، مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت مستند اور سرکاری دستاویزات اور کاغذات پر مبنی ہے، مصنف کے قول کے مطابق یہ مہاراج پرتاب سنگھ والیِ جے پور کے حکم سے سنہ ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں لکھی گئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے جے پور کے تمام محافظ خانوں ([illegible]) سے فائدہ اٹھایا ہوگا،

اس کے علاوہ اس کتاب میں صرف جے پور کے راجگان کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں میواڑ، مارواڑ اور ہاڈوتی کے حکمرانوں کے حالات پر بھی تبصرہ ہے، اور ان کے ضمن میں گجرات اور سندھ کے واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور مختصراً گجرات، سندھ اور دکن کے مشہور سپہ سالاروں اور فاتحین کے کارناموں کا بھی ذکر آ گیا ہے، غرض یہ کتاب راجستھان کی عظمت اور اسکی ثقافت اور اس کے شاندار کارناموں کا بیش بہا خزانہ ہے، اور راجستھان کے مورخین اور محققین نے اس کو راجستھان ہسٹری کا بہت ہی اہم اور نادر الوجود نسخہ قرار دیا ہے، اور یہ ان کا فرض ہے کہ وہ بہ نظر غائر اس مخطوطے کا مطالعہ کر کے ان شواہد و حقائق کو منظر عام پر لائیں جو اب تک مخفی ہیں، تاریخ راجستھان ابھی تشنہ ہے، اب تک اس کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں اس اہم ترین نسخے کا کہیں حوالہ نہیں ملتا، اگر اس ماخذ سے پورا کام لیا جائے تو اس سے راجستھان کی تاریخ کے متعلق بہت سے نئے معلومات حاصل ہوں گے،[1]

[1] مزید دیکھیے ہسٹاریکل جرنل اور (Recarcher) سنہ ۱۹۶۶ء دسمبر، از راقم الحروف اور راجستھان ہسٹوریکل کانگریس جودھپور سیشن۔

۸۔ **امیرنامہ**۔ امیرنامہ غیر مطبوعہ اور اہم ترین تاریخی مخطوطہ ہے، جو نہ صرف مجاہد آزادی اور بانی ریاست ٹونک نواب امیر الدولہ نواب امیرخاں کی سوانح ہے، بلکہ جنگ آزادی کی تحریک انگریزوں کے خلاف مرہٹہ اور پٹھان فرقوں کی متحدہ مساعی کی سرگذشت بھی ہے اور راجستھان، روہیلکھنڈ، یوپی، بھوپال، پنجاب اور دکن کے حالات کا مختصر جائزہ بھی منشی بساون لال شادان نائب میرمنشی نواب امیرخاں بہادر فردوس آشیانی کا مصنفہ ہے، اس کا ذکر معارف میں پہلے بھی کیا ہے[1]، ہمارے ہاں اس کا جو نسخہ ہے وہ نواب امیرخاں کی زندگی کا مکتوبہ ہے، اس لیے اہم اور نایاب ہونے کے علاوہ مستند بھی ہے، اس پر ریاست کے مدار المہام دیوان شمس الدین کے حواشی بھی ہیں، (نوشتہ ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء)

۹۔ **ظفرنامۂ امیر**۔ ظفرنامۂ امیر معروف بہ امیرنامہ منظوم از حافظ پاینڈ محمد خاں نکہت رامپوری، ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، رامپور کے شاعر نکہت نے امیرنامہ سے متاثر ہو کر نواب امیرخاں کے حالات اور کارناموں کو منظوم کیا ہے، کہیں کہیں شاعرانہ مبالغہ اور غلو ضرور ہے لیکن تاریخی حالات کو بڑے دلچسپ انداز میں منظوم کیا ہے،

۱۰۔ **تاریخ احمدی**۔ نواب وزیر الدولہ والی ریاست ٹونک مشہور مجاہد حضرت سید احمد شہید سے بیعت تھے، اس لیے سید صاحب کے شہید ہونے کے بعد نواب صاحبؒ نے آپ کے سوانح اور حالات مرتب کرائے، کچھ حالات سید صاحبؒ کے مریدوں نے بھی مرتب کیے، یہ حالات تاریخ احمدی اور مخزن احمدی اور مکتوبات احمدی کے نام سے موسوم ہیں، یہ سب ہمارے گرانقدر ذخیرہ میں محفوظ ہیں، ان میں تاریخ احمدی مصنفہ مولوی سید جعفر علی کا نسخہ بھی

[1] مزید دیکھئے معارف نمبر ۳ جلد ۹۰ ص ۲۲۳

(اسی امیرنامہ کو سرکار راجستھان کی طرف سے میں ہندی میں ایڈٹ کر رہا ہوں۔)

جو سید صاحبؒ کے سفر جہاد میں ان کے میرمنشی تھے، اس نسخے کی صرف جلد اول ہے، دوسرا نسخہ مولانا سید حیدر علی رامپوری ثم ٹونکی نے لکھا ہے، پہلا فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں، اسی تاریخ احمدی کا ایک حصہ دوم بھی ہے، جو میاں فتح علی کا مرتبہ ہے، یہ ۱۲۹۶ھ میں نواب یمین الدولہ محمد علی خاں صاحب بہادر جنت آشیانی والی ریاست ٹونک کے حکم سے لکھا گیا، یہ بھی اردو میں ہے، اور تاریخ احمدی کا تتمہ معلوم ہوتا ہے،

۱۱۔ **مخزن احمدی**۔ مخزن احمدی فارسی مولوی محمد علی[1] صاحب کی تصنیف ہے، اس میں سید صاحب کی ابتدائی چالیس سال کی تاریخ ہے، جو ۱۲۶۱ھ کی مصنفہ ہے، ہمارے ہاں اس کے تین نسخے ہیں، ایک ۱۲۸۲ھ دوسرا اور تیسرا نسخہ ۱۲۷۱ھ کا مکتوبہ ہے، مخزن احمدی حضرت سید احمد شہیدؒ کی زندگی اور تحریک پر پہلی کتاب ہے جو ابتدائی چالیس سال کی سوانح پر مشتمل ہے اور سب سے اہم اور مستند ہے، تاریخ احمدی بھی مستند اور اہم ہے لیکن یہ مخزن احمدی سے قدیم ہے،

۱۲۔ **مکتوبات سید احمد شہید صاحبؒ**۔ ہمارے ہاں سید صاحبؒ کے مکتوبات کے دو نسخے ہیں، ان میں سید صاحب کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے مریدین اور مجاہدین کو لکھے تھے، دونوں نسخوں کا مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں میں کہیں کہیں فرق ہے، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے مکاتیب کا مجموعہ بھی محفوظ ہے، اس میں ان کے چند مکتوب ہیں، اس کے بعد سید صاحب کی تحریک آزادی سے متعلق ایک استفتا، اور سید صاحب کا ایک مکتوب ہے، ایک نسخہ مولانا اسماعیل شہیدؒ کے فارسی مکتوبات کا بھی ہے، جو مولانا آزاد مرحوم کے حکم پر

[1] محمد علی سید صاحبؒ کے بڑے بھانجے تھے اور سید صاحب سے عمر میں بڑے تھے، انھوں نے سید صاحبؒ کی پیدائش سے لیکر راہ ہجرت میں قدم رکھنے تک کے حالات جمع کیے تھے، نواب محمد علی خاں والی ٹونک نے اس کو طبع کرایا تھا گراب وہ بہت کمیاب ہے،

مولانا غلام رسول مہر مصنف تاریخ سید احمد شہید کے مطالعہ کے لیے بھیجا گیا تھا، اور ابتک واپس نہیں ہوا، اسی طرح سید صاحب کے فارسی مکاتیب کا ایک اور مجموعہ بھی ہے، جو مولانا آزاد مرحوم کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، یہ بھی ابتک واپس نہیں ہوا،

۱۳۔ **متفرق مکتوبات** ۔ ان فارسی مکاتیب کا بھی ایک مجموعہ محفوظ ہے، جو سید صاحب نے اپنے ساتھیوں اور مریدوں کو لکھے تھے، یہ تمام خطوط سید صاحب کے خلیفہ مولوی نصیر الدین صاحب نے جمع کیے تھے، یہ نسخہ بھی مولانا آزاد مرحوم نے طلب فرمایا تھا جو ۱۹۵۹ء میں واپس آگیا اور ابتک محفوظ ہے،

۱۴۔ **ملہمات احمدیہ** ۔ اس نام کا ایک نسخہ کتب خانے کی فہرست میں درج ہے، جو مولانا آزاد کی فرمائش پر دہلی بھیجا گیا تھا، مگر واپس نہیں آسکا، اس لیے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا،[۱] غلام رسول مہر نے اپنی تاریخ سید احمد شہید میں اس کے متعلق لکھا ہے:۔

"اسکا نام معلوم نہیں ہو سکا، مصنفہ ابو الغضنفر مولوی نجف علی ابن ...... مولوی نجف علی صاحب جھجر کے باشندے تھے، ٹونک گئے اور وہاں سید صاحبؒ کے حالات سے رئیس کا شغف دیکھا تو عربی زبان میں سید صاحبؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا عبد الحیؒ اور شاہ محمد اسحٰقؒ کے حالات لکھ دیے۔"[۲]

---

[۱] غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف میں ملہمات احمدیہ کا ذکر نہیں کیا، پتہ نہیں موصوف کو یہ دستیاب ہو سکی یا نہیں، یہ کتاب ملہمات احمدیہ فارسی تصنیف ہے، خود سید احمد شہیدؒ سے منسوب ہے، اور جس نامعلوم الاسم رسالے کا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف کے آخذ میں تحریر کیا ہے وہ عربی میں ہے، دونوں کے مصنفین بھی الگ الگ ہیں، تصوف کے ذخیرے میں بھی ایک مخطوطہ ملہمات احمدیہ مصنفہ مولوی الٰہی بخش محفوظ ہے، اسکے مصنف مولوی الٰہی بخش سید صاحب کے مرید تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا ملہمات احمدیہ مصنفہ سید صاحب اور الٰہی بخش کی تصنیف میں کیا فرق ہے، اس لیے کہ سید صاحب سے جو تصنیف منسوب ہے وہ ہمارے پاس ابتک واپس نہیں آئی۔ [۲] تاریخ سید احمد شہیدؒ،

۱۵۔ **ظفر نامہ** ۔ منظومہ مولانا ہاتفی[۱]، بہت نادر قدیم اور اہم نسخہ ہے، تاریخی اعتبار سے تیموری شان اور چغتائی عظمت کی ایک دلچسپ داستان ہے ہی، ادبی لحاظ سے بھی ایک شاہکار ہے، ایک ایک شعر مولانا ہاتفی کی قادر الکلامی کا آئینہ دار ہے، مولانا نے اپنی یہ تخلیق چالیس سال میں مکمل کی تھی، اور شعر برائے شعر نہیں بلکہ ایک خاص جذبے سے لکھا ہے، اسلیے ظفر نامہ تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے ایک شاہکار ہے۔

یہ نسخہ ۹۷۶ھ مطابق ۱۵۶۸ء کا منقولہ یعنی عہد اکبری کا نوشتہ ہے۔

۱۶۔ **تاریخ تاج محل** ۔ کتاب کا اصل نام تاج گنج ہے، جہانتک پتہ چلا ہے یہ نسخہ غیر مطبوعہ ہے نسخہ ہذا میں مصنف، کاتب کسی کا نام تحریر نہیں ہے، شروع میں شاہجہاں اور اسکی اولاد اسکی محبوب بیگم ملکہ ممتاز کے کچھ حالات ہیں، اس کے بعد تاج محل کی تعمیر کے جملہ مصارف کا تفصیل سے ذکر ہے، اور اسکی تعمیر سے متعلق ہر چیز کا ذکر کیا گیا ہے، پتھروں کے اقسام، انکی قیمت، معماروں، زرنگاروں، مصوروں اور نقاشوں کے نام بھی دیے گئے ہیں، اصل کتاب فارسی زبان میں ہے، کاغذ کی ساخت اور کتابت سے مترشح ہوتا ہے کہ زیادہ قدیم نہیں ہے بلکہ کسی نسخہ کی نقل ہے، جو اب نایاب ہے اور یہ بھی کمیاب اور ابتک غیر مطبوعہ ہے۔[۲]

۱۶۔ **تاریخ نامعلوم الاسم** ۔ یہ نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہے لیکن صرف چند اوراق پر مشتمل ہے، اسلیے نہیں کہا جا سکتا کہ کس کتاب کا حصہ ہے، جو اوراق ہمیں دستیاب ہو سکے ہیں ان پر ۱۳۲ سے ۱۸۰ تک نمبر پڑے ہوئے ہیں جن میں مرزا شاہ رخ اور دنیا کے عجائب غرائب کا ذکر ہے، آخر میں بیجا نگر کا بھی کچھ تذکرہ ہے۔

---

[۱] Catalogue of Persian manuscripts of India office library by Elte PP. 1398–1409; Index P. 866

[۲] برٹش میوزیم میں بھی اسکا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں نقل کیا گیا تھا جس میں تاج محل کے متعلق مصارف کا ذکر اور ممتاز محل کا حال اس کی موت پر شاہجہاں کے اشعار اور سکندرہ کے متعلق بھی کچھ نوٹس ملتے ہیں، یہ پتہ نہیں کہ دونوں ایک ہی نسخہ کی نقل ہیں یا مختلف نسخوں کی، ہمارے ہاں کا نسخہ بھی اٹھارہویں صدی کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے، اس نسخے کا ذکر کیٹلاگ میں ص ۴۴۳ پر کیا گیا ہے Catalogue of British Museum ۷۱ / ۱، اس کا ایک قدیم مخطوطہ کتب خانہ دار المصنفین میں بھی ہے،

امام محمدؒ کی بارہ سو (۱۲۰۰) سالہ یادگار وفات ترکی میں

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، پیرس

امام محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی کی ساٹھ سالہ جوان عمری میں ۱۸۹ھ میں بمقام ری (طہران) وفات ہوئی، جب یہ شہر ہارون رشید کا دار الخلافہ تھا، اور امام محمد اس کے قاضی القضاۃ تھے، اس پر اب پورے بارہ سو سال گذر چکے ہیں،

امام محمد صاحبین یعنی امام ابو حنیفہ کے دو بڑے شاگردوں (اور بازووں) میں سے ایک ہیں، دوسرے صاحب امام ابو یوسف ہیں، امام اعظم ابو حنیفہ نے فقہ (اسلامی قانون) کی ایسی خدمت کی کہ آسمان پر چڑھ کر ثریا کے تارے توڑ لئے، انھوں نے فقہ کی تدوین کے لیے ایک اکاڈیمی قائم کی لیکن فقہ پر انھوں نے بظاہر کوئی کتاب نہیں چھوڑی جو ان کی اپنی تالیف ہو، امام ابو یوسف کا تحریری کارنامہ بھی محدود ہے، ایک چھوٹی سی (لیکن اہم) کتاب الخراج لکھ کر اسمیں اسلامی سرکاری مالیے کی وضاحت فرمائی ہے، الرد علی سیر الاوزاعی لکھ کر قانون بین الممالک کے مباحث میں حصہ لیا، ان کی طرف منسوب المخارج فی الحیل کا ایک مخطوطہ استانبول میں ہے، لیکن یہ فقہ کا ایک پہلو یا فقہ کی کسی جامع کتاب کا محض ایک باب ہے،

اس کے برخلاف امام محمد نے ایسی کتابیں چھوڑی ہیں جو قانون کے سارے پہلوؤں پر حاوی اور مفصل و ضخیم ہیں، ان حالات میں امام محمد کو فقہ حنفی کا "تحریری بانی" کہنا شاید بیجا نہ ہوگا

بعد کے سارے حنفی فقہاء ان ہی کے خوشہ چیں ہیں،

ان کے استادوں میں امام مالک ہیں تو شاگردوں میں امام شافعی بھی ہیں (اور امام شافعی کے ایک بڑے شاگرد امام ابن حنبل ہیں)، اس طرح تمام فقہی مذاہب کے منتسب آپ کا ادب کرتے اور آپ کی یادگار میں ذوق و شوق سے شریک ہیں، ایران کو یہ خصوصیت ہے کہ یہ وہاں کے قاضی القضاۃ تھے، اور وہیں جبل طبرک پر دفن ہوئے (بعض روایتوں میں رنبویہ کا بھی ذکر آتا ہے، کوہ طبرک آج تک موجود و معروف ہے اور طہران کے مضافات میں وہاں آجکل ایک دوست طالب علم عفان سلجوقی کی اطلاع کے مطابق سیمنٹ سازی کا کارخانہ قائم ہے، رنبویہ غالباً رنگ اور بو کا مرکب کوئی گلستاں تھا، اور شاید کوہ طبرک ہی پر ہارون رشید نے اسی پرفضا مقام پر ان کو دفن کرنے کا حکم دیا ہو)

امام محمد ۱۳۲ھ کے ہنگامہ خیز سال میں پیدا ہوئے جب توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء کے مصداق امویوں کے دور کا خاتمہ کر کے عباسی برسر اقتدار آ رہے تھے، کچھ بڑے ہوئے تو اس زمانہ کے سب سے بڑے علمی مرکز کوفہ (سابق حیرہ) میں تعلیم پائی، پھر جب بغداد بسایا گیا تو وہاں نظر آتے ہیں، مکہ جاکر ابن عیینہ سے، مدینہ جاکر امام مالک سے، دمشق (بیروت؟) جاکر امام اوزاعی سے، ایران جاکر حضرت عبد اللہ بن مبارک سے تعلیم پائی (یہ دار الاسلام کی اس زمانے میں بڑی جامعات یعنی یونیورسٹیاں تھیں، امام محمد ان سب کے سند یافتہ تھے، گویا ایک نہیں چھ چھ ڈاکٹریٹ کی تھیں)، پھر خود تعلیم دینی شروع کی، غالباً بغداد میں۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ جس مسجد میں یہ درس دیتے تھے، اور ان کی کتابیں ان کے شاگرد ان کے سامنے پڑھ کر اپنے نسخوں کی تصحیح کرتے، اور تشریح پوچھ کر پوری طرح مؤلف کا منشا سمجھتے اور اس سے کتاب کی روایت کی اجازت حاصل کرتے، وہاں ایک بد خو ہمسایہ

کتاب الدول کا مولف ابن الراوندی[1] بھی آیا کرتا تھا، وہ عمداً وہی دن اور وہی وقت مقرر کرتا جو امام محمد مقرر کرتے، جب دونوں جماعتیں مسجد میں ایک ساتھ شروع ہوتیں تو راوندی کے شاگرد چیخ پکار کرتے اور شور مچاتے، اس لیے امام محمد نے اپنی درس گاہ بدل دی اور ایک دوسری مسجد میں درس دینے لگے، یہ پچاس سال کے تھے جب قاضی القضاۃ امام ابویوسف کا انتقال ہوگیا، ہارون رشید کو امام محمد سے بہتر کوئی بدل نہ مل سکا۔ اس نے رقہ کو (جو اب شام میں ہے) دارالخلافت بنایا تو یہ بھی ساتھ گئے، اس زمانے میں ایک شیعہ بغاوت ہوئی، اس کے سرغنے کو ہارون رشید نے تحریری اطمینان دلایا کہ اگر وہ ہتھیار ڈالدے تو اس کو جان کی امان دیجائے گی، جب یہ لوگ گرفتار ہوکر آئے تو ہارون رشید نے ان کو قتل کرنا چاہا، امام محمد نے امان یافتہ کے قتل کو حرام بتایا، ہارون رشید نے لاکھ سیاسی مصلحتیں بتائیں لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوئے، اس پر خلیفہ نے جھلا کر سامنے رکھی ہوئی دوات ان پر پھینک ماری اور ان کے عہدے سے ان کو برطرف کردیا، چند روز کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا اور رقہ کی جگہ رے (طہران) کو دارالخلافہ بنانا طے ہوا تو امام محمد کی طلبی ہوئی، چنانچہ وہ ہارون رشید کے ساتھ گئے، اور وہیں وفات پائی اور دفن ہوئے، عام تذکرہ نویس تاریخ وفات ۱۸۹ھ بتاتے میں متفق ہیں، لیکن میرے علم میں کسی نے دن اور مہینے کی تعیین نہیں کی ہے، البتہ کتبخانہ سعیدیہ (حیدرآباد دکن) کے موجودہ ناظم الحاج محمد عبد الغنی صاحب کی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ کتب خانہ

---

[1] یہ غالباً مشہور محمد ابن الراوندی نہیں ہے، جس کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے، اس کا تعلق غالباً اس راوندیہ فرقے سے ہے جس کے متعلق مروج الذہب میں مسعودی نے لکھا ہے کہ اسکے عقیدہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا حق (بطور وراثت) حضور کے چچا حضرت عباس اور پھر ان کی اولاد کو حاصل ہوا۔

میں ایک قلمی عرائس نامہ (یا اعراس نامہ) ہے جو کم از کم دو سو سال قبل کا لکھا ہوا ہے، اس میں ہے کہ امام محمد کی وفات ۱۴ رجمادی الآخرہ ۱۸۹ھ دوشنبہ کے دن ہوئی، کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریر کو غلط سمجھا جائے گو اس کتاب کے مؤلف کا ماخذ ہم کو معلوم نہیں ہے۔

امام محمد کو کم عمری ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا، کردری، طاشکوپری زادہ وغیرہ متعدد مولفوں نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ امام محمد کے ہاں دس رومی (یونانی) لونڈیاں تھیں جو عربی میں اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں، جب امام محمد تالیف کے کام میں مشغول ہوتے تو انکے سامنے پانی سے بھرا ایک پیالہ ہوتا اور یہ لونڈیاں ان کو "علم" (غالباً فقہ) پڑھ کر سناتی رہتی تھیں،

امام محمد شیبانی کہلاتے ہیں، مگر وہ اس قبیلے کے مولود نہیں مولی تھے، معلوم نہیں کسی دوسرے عرب قبیلے کے فرد تھے یا خدا نے انھیں غیر عرب لوگوں میں پیدا کیا، ان کے والدین دمشق کے باشندے اور فوج میں ملازم تھے لیکن خود یہ واسط (عراق) میں پیدا ہوئے،

الکفوی نے (جو کریمیا، روس، کے شہر کفہ کے سپوت گزرے ہیں) حنفی فقہاء کا ایک ضخیم تذکرہ لکھا ہے، جو میرے علم میں تاحال چھپا نہیں ہے، استنبول میں اس کے مخطوطے میں لکھا ہے کہ امام محمد نے (۹۹۰) تالیفیں کیں، لیکن اب دس بارہ سے زیادہ نہیں ملتیں، کچھ چھپی ہیں، کچھ چھپ رہی ہیں، اور الامالی الکیسانیات کے سوا (جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے اور جو چھپ بھی گئی ہے) باقی کل موجود کتابوں کے نسخے استانبول میں ہیں۔

ترکی جشن اور نمائش مخطوطات امام محمد

اپنی موجودہ گئی گذری حالت میں بھی ترکی میں اسلامیات کا جتنا ذوق و شوق ہے وہ نہ عرب ممالک میں نظر آتا ہے نہ عجم میں، چونکہ جمادی الآخرہ اس سال گرمائی تعطیلات میں پڑ رہا ہے اس لیے بارہ سو سالہ جشن استانبول میں ۱۰ رمئی ۱۹۶۹ء یعنی ماہ صفر میں منایا گیا، استانبول یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات، استانبول ہی کے معہد عالی اسلامیات اور ترکی

کے سارے معہد ہائے عالیِ اسلامیات کے طلبہ کے وفاق (فیڈریشن) نے مل کر یہ جشن منایا،
اور استانبول کے مرکزی کتب خانہ مخطوطات (سلیمانیہ گنل کتب خانہ سی) میں دو ہفتوں تک
کتابوں کی نمائش ہوئی،

جشن میں چار، پانچ تقریریں ہوئیں: امام محمد کے حالات، امام محمد کا درجہ تدوین فقہ حنفی
میں، امام محمد کا ماحول اور علمی کارنامہ، امام محمد کے معاصر، یورپ میں قانون کی حالت،

آخر الذکر تقریر اپنی دلچسپی کے باعث ذرا تفصیل کی محتاج ہے، ڈاکٹر صالح طوغ جامعہ
استانبول کے شعبۂ اسلامیات کے ایک نوعمر استاد ہیں، شعبۂ قانون کے بھی گریجویٹ ہیں اور
اسلامی حکومت کے آمد و خرچ (زکوٰۃ) پر مقالہ لکھکر ڈاکٹریٹ کی ہے، انھوں نے بتایا کہ
امام محمد کا معاصر مغربی یورپ (جرمنی، فرانس، اٹلی) میں سب سے بڑا بادشاہ شارلمان تھا، لیکن
وہاں کوئی معاصر بڑا ماہر قانون نہیں ملتا، اس زمانے میں قانون نام تھا عرف و عادت اور
رسم و رواج کا، چاہے وہ احوال شخصی (نکاح طلاق کے متعلق ہو یا کاروبار اور معاملات
کے متعلق، مرد کو طلاق کا غیر محدود حق تھا، لیکن مطلقہ عورت کو نکاح ثانی کی اجازت نہ تھی،
نکاح میں عورت یا تو اس کے سرپرستوں سے خریدی جاتی تھی یا چوری اور لوٹ میں پکڑ لائی جاتی
تھی، تعدد زوجات نہ صرف عوام میں بلکہ عیسائیوں اور پادریوں میں بھی رائج تھا، جو تحریری
قوانین تھے وہ چند شاہی احکام پر مشتمل تھے، جو زیادہ تر شارلمان نے اپنی عرف خاص کی
جاگیروں کے انتظام کے متعلق دئے تھے، "کاپی چولاریا" نامی ایک زمانۂ مابعد کی تالیف ہیں،
ایک باب شارلمان کے ایسے احکام پر بھی ہے، یہ تھی دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی)
کے یورپی قانون کی حالت،

ظاہر ہے کہ اس کا امام محمد کی کتاب الاصل سے (جس میں ساٹھ باب ہیں اور جو مخطوطہ مراد ملا

استانبول میں آٹھ جلدوں میں اور تقریباً پانچ ہزار صفحوں پر مشتمل ہے) کیا مقابلہ، کتاب الاصل کا
مقابلہ رومن قانون کی مشہور کتاب "مجموعۂ قوانین جسٹی نین" بھی نہیں کر سکتی جسٹی نین رومی (بیزنطینی)
بادشاہ تھا، رسول اکرم ﷺ کی ولادت مبارک سے پانچ سال قبل اس کی وفات ہوئی، استانبول
کی مشہور مسجد آیا صوفیا اسی نے بنائی تھی، یہ پہلے ایک بت خانہ تھا جسٹی نین نے جبراً اس پر قبضہ کر کے
اسے عیسائی کلیسا بنایا، سلطان محمد ثانی نے ۱۴۵۳ء میں استانبول فتح کیا تو صلیب پرستی کے مرکز
کو خدا پرستی کا معبد بنایا)، جسٹی نین نے رومی قانون کی تالیفوں میں اختلافات دیکھکر ایک
کمیٹی بنائی کہ وہ ان سے انتخاب کر کے قابل عمل و مناسب احکام کا ایک مجموعہ تیار کرے،
(اسے فتاوی عالمگیریہ سے مشابہ کہا جا سکتا ہے) ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اپج نہ تھی، اس کے
برخلاف امام محمد کے سامنے کوئی نمونہ تھا ہی نہیں، ان کے استاد امام مالک کی موطا فقہ کی
کوئی کتاب نہیں، زید بن علی کی کتاب المجموع اگر موجود تھی بھی تو اتنی مختصر کہ روزمرہ کی ضرورتیں
بھی اس سے پوری نہیں ہو سکتیں،

نمائش کتب استانبول کی مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں ایک سو سے زیادہ کتب خانے
تھے، اب ان سب کو یکجا کیا جا رہا ہے، چنانچہ سلیمانیہ کتب خانۂ عمومی میں اب (۹۲) کتب خانے
اکٹھا ہو گئے ہیں، ان کے علاوہ توپ قاپی سرائے، جامعۂ استانبول، ملت، بایزید، کوپرولو،
راغب، مراد ملا، نور عثمانیہ، اسکدار، وغیرہ کے کتب خانے ابھی مستقل عمارتوں میں ہیں،
سلیمانیہ کتب خانۂ عمومی میں اب ڈیڑھ لاکھ سے کم قلمی کتابیں نہ ہوں گی، جامعہ کے کتب خانے
میں پچیس ہزار مخطوطات ہیں، دوسرے کتب خانوں میں سے ہر ایک میں کئی کئی ہزار قلمی
کتابیں ہیں، ان کے علاوہ آرشیف کے نام سے سرکاری دستاویزات کا ایک پکا ذخیرہ
ہے جس میں چوالیس ملین دستاویزیں اور رجسٹر ہیں،

امام محمد کی یادگاریں انکی تالیفوں کے جو مخطوطے ہیں ان کو نمایاں کیا گیا، انکی کچھ تفصیل بے محل نہ ہوگی:

(۱) کتاب الآثار کے (۱۵) نسخے ہیں، بروکلمان اور فواد سزگین کی فہرستوں کے مطابق باقی دنیا میں اس کے مزید (۳) نسخے ہیں، اس میں فقہی احادیث ہیں اور یہ چھپ بھی گئی ہے،

(۲) کتاب الاصل جس کو کتاب المبسوط بھی کہتے ہیں، ۲۲ نسخے تھے، قدیم ترین نسخہ ۳۹۰ھ کا احمد بن محمد الطلحی الاصفہانی کا لکھا ہوا ہے، باقی دنیا میں ۱۰ اور نسخے ہیں، انکی ایک درمیانی جلد مصر کے قبطی پروفیسر شفیق شحاتہ نے کچھ عرصہ ہوا چھاپی تھی، اب دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن میں کامل اشاعت ہو رہی ہے، اور تاحال دو جلد چھپ چکی ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کے دنیا کے کسی نسخے میں وقف اور ادب القاضی ہی نہیں حج کا باب بھی نہیں ہے، حالانکہ سرخسی وغیرہ اپنی شروح میں اس کا ذکر کرتے ہیں، کتاب الاصل کا خلاصہ الحاکم المروزی نے المختصر الکافی کے نام سے مرتب کیا، اس کا ایک بہت پرانا ۵۹۶ھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ نمائش میں رکھا گیا تھا، دائرۃ المعارف کی تازہ اشاعت میں حج کا باب اسی المختصر الکافی سے لے کر کتاب الاصل میں شامل کیا گیا ہے، سیر صغیر کا ذکر نیچے آتا ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کتاب الاصل کے متعدد ابواب (طہارۃ، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، جنایات، سیر) سوال جواب کے طور پر مرتب کئے گئے ہیں، مثلاً کتاب السیر میں "قلتُ ارایت... قال..." کر کے امام ابو یوسف کا ایک سوال اور امام ابوحنیفہ کا دیا ہوا اس کا جواب ہوتا ہے، اس طرح اس باب میں آٹھ سو سے کچھ زائد سوال اور اتنے ہی جواب ہیں، میرا ناچیز گمان یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون کی اکاڈیمی کی یہ رپوٹیں ہیں، اور امام محمد نے ان کو بجنسہ محفوظ کر دیا، ان میں ان کو کسی حذف یا اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی، باقی ابواب میں صرف احکام کا مجموعہ ہے جیسا فقہ کی ہر کتاب میں ہوتا ہے، سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط میں لکھا ہے کہ امام محمد نے اپنی اکثر تالیفوں

کو ایک سے زائد بار از سر نو لکھا اور نئے ایڈیشن میں اتنی ترمیم کی کہ اس کو سابق سے کوئی تعلق بھی نہ رہا، اس نمائش میں ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ کتاب الاصل کے دو مختلف سٹ ہیں، ایک سٹ میں جو اکثریت پر مشتمل ہے، کتاب السیر اسی سوال وجواب کے نہج پر ہے، لیکن دوسرے سٹ مثلاً مخطوطہ جار اللہ نمبر ۶۰۵ میں یہ باب عام ابواب کی طرح احکام کی تفصیلات کا مجموعہ ہے، دونوں قسم کے مخطوطوں کا سرسری مقابلہ کیا تو دیگر ابواب اور فصلوں میں بھی کافی فرق نظر آیا، جس میں حذف و اضافہ بھی ہے، زندگی ہے تو انشاء اللہ اس کی مزید تدقیق کی جائے گی، دوسرے اہل علم بھی اس گتھی کو حل کرنے کی کوشش فرمائیں، ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کے ابواب مستقل کتابوں یا رسالوں کے طور پر بھی ملتے ہیں، ابن ندیم وغیرہ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے، اور کتاب الصلوٰۃ، کتاب الکسب، کتاب الحیل وغیرہ اب بھی مستقل مخطوطات کی صورت میں ملتی ہیں،

(۳) جامع صغیر کے (۱۳) نسخے تھے، باقی دنیا میں (۷)، دوسرے نسخوں کا پتہ چلتا ہے، یہ کئی بار چھپی ہے، اس کی بہت سی شرحوں میں ایک سرخسی نے بھی لکھی ہے جس کا دنیا میں واحد نسخہ استنبول میں ہے،

(۴) جامع کبیر کے (۴) نسخے تھے، (۲) اور نسخے باقی دنیا میں ہیں، احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے اسے بھی چھاپ دیا ہے،

(۵) کتاب الحج کے یہاں دو نسخے تھے، باقی دنیا میں مزید (۲) نسخے ہیں، اس میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے فقہی اختلافات کا ذکر ہے، جس سے مراد مالکی اور حنفی مذاہب ہیں، یہ کتاب بھی حیدرآباد میں چھپ گئی ہے،

(۶) کتاب الزیادات کے (۴) نسخے تھے، (۲) اور باقی دنیا میں ہیں، یہ آجکل مصر میں

وہاں کے ایک نوجوان عالم چھاپ رہے ہیں، بہ ظاہر یہ کتاب لاصل کا تتمہ و تکملہ ہے۔

(۷) کتاب زیادات الزیادات کا جس کو سابق الذکر کا ضمیمہ کہنا چاہیے، ایک نسخہ تھا، دنیا میں اس کا (۱) مزید نسخہ معلوم ہوا ہے، سرخسی کی شرح نکت زیادات الزیادات کے نام سے اسے بھی احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے چھاپا ہے۔

(۸) کتاب السیر الصغیر دنیا میں ناپید سی ہے، یہ قانون بین الممالک یعنی جنگ و صلح کے احکام پر مشتمل ہے، سرخسی نے لکھا ہے کہ اس کی تالیف پر امام محمد کے استاد امام اوزاعی نے تنقید کی کہ اس میں احادیث کا ذکر اور رسول اکرمؐ کے طرز عمل کا بطور نظائر ذکر نہ ہونے کی وجہ سے کتاب ناقص ہے، اس پر امام محمد نے کتاب السیر الکبیر تالیف کی، اس کتاب السیر الصغیر کا ابتک پتہ کہیں نہ چلا، لیکن مذکورۂ بالا کتاب المختصر الکافی الحاکم المروزی نے متعلقہ باب کا عنوان کتاب السیر الصغیر دیا ہے، اور اس کی شرح جو المبسوط للسرخسی کے نام سے موجود و مطبوع ہے اس کی جلد دہم صفحہ (۱۴۴) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جہاں لکھا ہے کہ "سیر صغیر کی شرح مکمل ہوئی" لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ کتاب الاصل میں سیر کا باب مروزی اور سرخسی کے اس سیر صغیر سے بالکل مختلف ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الاصل کے باب السیر کے خلاصے میں مروزی کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ مولف امام محمد ہی کا مختصر رسالہ سیر صغیر نقل کر دیں،

(۹) کتاب السیر الکبیر کا اب کوئی نسخہ نہیں ملتا، صرف اس کی شرح جو سرخسی نے کی ہے متداول ہے، اس کے بیسیوں نسخے ملتے ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے عرصہ ہوا اسے چار جلدوں میں چھاپا تھا، چند سال قبل سرخسی کی یادگار نمائش میں اس کے سارے نسخے استانبول میں جمع کئے گئے تھے، اس دفعہ اس کا صرف ایک نسخہ جو الحصیری کا نقل کردہ بیان کیا گیا ہے، کتبخانہ داماد ابراہیم پاشا سے لاکر نمایاں کیا گیا تھا، یہ ۵۷۳ھ کا لکھا ہوا ہے، ممکن ہے نقل النقل ہو۔

(۱۰) امام محمد کی طرف ایک عقیدہ بھی منسوب ہے، جسے کسی نے منظوم کیا ہے، اسکے کئی نسخے تھے لیکن یہ ذرا مشتبہ سی ہے۔

(۱۱) المخارج فی الحیل کا ایک نسخہ کتب خانہ شہید علی پاشا سے آیا تھا، کتاب الاصل میں بھی حیل کا باب ہے لیکن ان دونوں میں مشابہت نظر آئی، زیر نمائش نسخے میں مسائل عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ مروی ہے، میں نے تحقیق نہیں کی، اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ امام محمد ہی کی تالیف ہے، یا امام ابی یوسف کی، یا خود امام ابو حنیفہ کی، سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حیلہ ہائے شرعی کی اس کتاب پر کسی نے ہارون رشید کے یہاں چغلی کھائی اور امام محمد کو زندیق قرار دیا، پولیس آئی، ہنگامہ ہوا، اور امام محمد کی ساری کتابوں کو ضبط کرکے ان کی فہرست لکھی گئی، انسپکٹر نے کتاب الحیل کو کتاب الخیل (گھوڑوں کی کتاب) پڑھکر غصے سے ایک طرف پھینک دیا، اور اس کو مال غنیمت میں داخل نہیں کیا، اس طرح امام محمد کی خدا نے لاج رکھ لی، اس کے مماثل ایک قصہ کتاب الاکراہ کے متعلق ہے جس میں یہ بحث ہے کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ جان کی دھمکی دے کہ کسی سے اسکی منکوحہ خوبصورت بیوی کو طلاق دلائے تو اس کا کیا اثر ہوگا، ہارون رشید سے درباریوں نے کہا کہ اس میں امام محمد نے خلیفہ کو ڈاکوؤں سے مشابہ قرار دیا ہے، اس پر پولیس نے ان کا گھر محاصرے میں لے لیا، امام محمد کے ایک شاگرد نے کسی ہمسایہ کے مکان کی چھت سے امام محمدؒ کے مکان میں کود کر اس رسالے کو گھر کے کنوئیں میں پھینک دیا اور پولیس تلاشی کے بعد ناکام واپس گئی، امام محمد نے دوبارہ وہ مسائل لکھنے چاہے مگر طبیعت مائل نہ ہوئی، چند دن کے بعد اس کنوئیں کو صاف کرانے کے لیے مزدور بلایا، اس نے دیکھا کہ ایک کتاب ایک ابھرے ہوئے پتھر پر پڑی ہوئی ہے، اس طرح یہ کتاب دوبارہ مل گئی اور اس پر امام محمد کو بڑی مسرت ہوئی۔

(۱۲) کتاب الموطا جو امام مالکؒ سے سنی ہوئی فقہی حدیثوں پر مشتمل ہے، اسکے (۲۱) نسخے نمایاں

کئے گئے تھے، دنیا میں اس کے مزید (۳) نسخے ملتے ہیں،

اس تفصیل سے ناظرین کو استانبول کے کتب خانوں کی ثروت کا اندازہ ہوگیا ہوگا، اگر ساری دنیا کے کتب خانے ایک طرف رکھے جائیں اور استانبول کے کتب خانے ایک طرف تو بھی استانبول کا پلہ بھاری رہے گا،

امام محمد کی کتاب الامالی جسے الکیسانیات بھی کہتے ہیں استنبول میں نہیں ہے، کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے کی اساس پر اسے حیدرآباد میں چھاپا گیا ہے،

دوسری کتابوں میں سے کتاب الرأی اور کتاب الاصول ان کی طرف منسوب ہیں، مگر افسوس ہے کہ ابتک لاپتہ ہیں، کتاب الاصول کا ایک جملہ کہ "امام محمد کے مطابق فقہ کے اصول یعنی مصادر چار ہیں" ابوالحسین البصری المعتزلی نے اپنی کتاب المعتمد میں نقل کیا ہے، مولانا ابوالوفا الافغانی مدظلہ نے لکھا ہے کہ سرخسی کی کتاب الاصول اسی امام محمد کی کتاب الاصل کی شرح ہے لیکن مجھے اس میں تامل ہے، کیونکہ سرخسی نے اپنی کتاب کے دیباچے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ امام محمد کی کتاب کی شرح ہے (جیسا کہ اپنی دوسری تالیفوں کی تمہید میں وہ ہمیشہ بیان کرتے ہیں) بلکہ یہ لکھا ہے کہ امام محمد کی مختلف کتابوں کی شرح کرچکا ہوں، لیکن ان کے طرز استدلال کو سمجھنے کے لیے ایک مستقل کتاب اصول فقہ پر ضروری ہے، اس لیے یہ کتاب املا کراتا ہوں، اور کتاب کے اندر "امام محمد نے کہا کہ ..... اور اس کی اساس یہ ہے کہ ....." کا طرز، جو ان کی دوسری کتابوں میں ہے، اس میں نہیں ملتا، میری ناقص رائے میں یہ امام محمد کی کتاب کی شرح نہیں بلکہ شمس الائمہ سرخسی کی اپنی تالیف ہے،

یہ ہیں مختصر حالات امام محمد کے جشن کے جو ترکی میں منایا گیا، ممکن ہو دیگر حنفی، شافعی اور مالکی ممالک بھی اپنا فریضہ یاد کریں، جامعہ پارس کے کلیۂ قانون میں بھی توقع ہے کہ قریب میں مماثل جشن ترتیب دیا جائے گا۔

وفیات

ذاکر صاحب

از سید صباح الدین عبدالرحمن

ذاکر صاحب کو جن کو مرحوم لکھتے وقت قلم تھرتھرا رہا ہے، میں نے آج سے ۴۲ سال پہلے ۱۹۲۷ء میں مظفرپور میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اُس وقت میں انٹرمیجیٹ میں تعلیم پا رہا تھا، وہ حکیم اجمل خاں مرحوم کے ساتھ ایک وفد میں جامعہ ملیہ کا چندہ جمع کرنے کے لیے وہاں تشریف لائے تھے، اسی زمانہ میں وہاں ایک دینی اجتماع تھا جس میں مولانا نثار احمد مرحوم (مولانا محمد علی مرحوم کے کراچی جیل کے ساتھی) حافظ احمد سعید دہلوی مرحوم وغیرہ کے مواعظ ہو رہے تھے، رات کی ایک نشست میں جامعہ ملیہ کا وفد اس اجتماع میں بھی شریک ہوا، حکیم اجمل خاں مرحوم کی ایک تقریر جامعہ ملیہ کی اہمیت پر ہوئی جس میں انھوں نے ذاکر صاحب کا ذکر خاص طور پر کیا کہ وہ برلن سے تعلیم پاکر آئے ہیں، لیکن بڑی ملازمت تلاش کرنے کے بجائے ایثار و خدمت کے جذبے میں جامعہ ملیہ سے منسلک ہوگئے ہیں، انکی تقریر ختم ہوئی تو پنڈال پر ذاکر صاحب کو لاکر کھڑا کیا گیا، ان کے چہرہ پر اس وقت سیاہ داڑھی تھی، چہرہ کا رنگ بہت گورا تھا، سیاہ داڑھی میں چہرہ ایسا دمکتا اور چمکتا نظر آیا، جیسے رات کی تاریکی میں برق چمکتی دکھائی دے، انھوں نے کوئی تقریر نہیں کی، ان کے لبوں پر تبسم تھا متین بلکہ شرمگیں نظریں نیچی تھیں، مشکل سے ایک منٹ کھڑے رہے ہوں گے کہ پھر اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھ گئے، میرے کچھ ساتھیوں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ کیا یہ سحرآگیں اور ایسی شرمگیں آنکھیں جامعہ ملیہ جیسے ادارہ کے لیے مفید ہوسکیں گی؟

اس وقت سے میری نظروں میں ذاکر صاحب برابر گھومتے رہے، اسی زمانہ میں میرے کچھ اعزہ اور ساتھی جامعہ ملیہ میں تعلیم پا رہے تھے، ان کی زبانی جامعہ ملیہ کا ذکر سنتا جس میں وہ زیادہ تر ذاکر صاحب کی ملنساہٹ اور شرافت طبع کے روزمرہ کے واقعات سناتے، اس سے اندازہ ہوتا کہ وہ بچوں سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں زمانہ گذرتا گیا، میں بی۔ اے پاس ہوا، ایم۔ اے کی تعلیم بھی ختم کی، لیکن ان کو کہیں پھر نہیں دیکھا، اخباروں میں انکا کوئی ذکر آجاتا تو اس کو ضرور پڑھتا، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ وطن تشریف لاتے تو اپنی مجلسوں میں جب کبھی ان پر گفتگو کرتے تو اس کو بڑی توجہ سے سنتا، ان کو ذاکر صاحب سے بڑا لگاؤ رہا، انکی صلاحیت، قابلیت، جذبۂ ایثار، سادگی، قناعت، استغنا کا ذکر دیر تک کرتے رہتے اور فرماتے کہ مسلمانوں کو ان ہی جیسے ایثار پسند اور خدمت گذار افراد کی ضرورت ہے۔

میری پوری طالب علمی کے زمانہ میں ذاکر صاحب کی شہرت میں چار چاند لگ گئے، میں پٹنہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی تعلیم پاکر علی گڑھ ٹریننگ کالج میں داخل ہوگیا، یہاں کی ڈگری پانے کے بعد میری خواہش ہوئی کہ میں کچھ دنوں ذاکر صاحب کی صحبت میں جامعہ ملیہ جاکر رہوں، میں نے اس کا ذکر اپنے محترم استاد جناب غلام السیدین صاحب سے کیا، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے، انھوں نے میری خواہش کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے ان کی ذات سے میری گرویدگی اور شیفتگی کا ذکر خاص طور پر کیا، میں یہ خط لیکر ان کے پاس پہنچا، جب ان کو معلوم ہوا کہ میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا عزیز بھی ہوں تو پھر مجھ سے اس طرح ملے جیسے میں ان ہی کا عزیز خاص ہوں، یہ ۱۹۳۴ء کا سال تھا، ان کی باتوں میں مجھکو نرمی محبت، اخلاص، ہمدردی کی رنگا رنگی کی قوس و قزح نظر آئی، میں انکی صحبت میں پہنچنے کو تو پہنچ گیا تھا، مگر میں جامعہ ملیہ میں داخلہ نہیں لے سکتا تھا کیونکہ میری تعلیم کے سارے مدارج ختم ہوچکے تھے، میں وہاں ملازمت بھی نہیں چاہتا تھا، لیکن مجھکو مشغول بھی رہنا تھا، مشکل یہ تھی کہ ذاکر صاحب کا موضوع معاشیات تھا جس سے مجھکو کوئی مناسبت نہ تھی، مجھکو دلچسپی تاریخ اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کی تاریخ

سے تھی، جو پروفیسر محمد مجیب صاحب کا موضوع تھا، اس لیے ذاکر صاحب نے مجھکو ان ہی کے ساتھ کام کرنے کو کہا۔

جامعہ ملیہ اس زمانہ میں قرول باغ، دہلی میں کرایہ کے مکانات میں تھی، تمام اساتذہ کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گذرتی تھی، ان کو اپنی اس عسرت اور تنگی پر بڑا ناز تھا، ایثار پسند اساتذہ کا بڑا اچھا اجتماع ہوگیا تھا، ان ہی میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، محمد علی بی اے (آکسن) (مولانا محمد علی نہیں)، مولانا اسلم جیراجپوری مصنف تاریخ الامت، مولانا عبد الحیٰ مفسر قرآن، مس فلپس بورن، مولانا اشرف الدین ٹونکی اور جناب عبد الغفار مدھولی وغیرہ تھے،

اس زمانہ میں معاشیات کے ایک استاد محمد عاقل صاحب بھی تھے، انھوں نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، ان کے ساتھ حسین حسان ندوی صاحب اڈیٹر پیام تعلیم بھی رہتے تھے، ذاکر صاحب نے ان ہی دونوں حضرات کے ساتھ مجھکو بھی رہنے کے لیے جگہ دی، اسی کے قریب ذاکر صاحب کا بھی مکان تھا، انکی تنخواہ اس وقت ۷۵ پچھتر روپئے ماہانہ تھی، جو اکثر کئی مہینوں تک نہیں ملتی تھی، اس میں سے تیس روپئے تو اپنے مکان کا کرایہ دیدیتے تھے، بقیہ ۴۵ روپئے میں اپنے سارے اخراجات پورے کرتے تھے، ان کے مکان کے باہری کمرہ میں صرف تین چار مونڈھے تھے، جن کے نیچے کوئی فرش بھی نہ تھا، ان ہی مونڈھوں پر بیٹھ کر وہ اپنے ملنے والوں سے باتیں کرتے، ان کے یہاں اس زمانہ میں بھی ہر قسم کے لوگ آتے رہتے، رہنمایان قوم بھی، عہدیداران حکومت بھی، علمائے اسلام بھی، شعرا بھی، مصنفین بھی، مبلغین مذہب بھی، ملحدین بھی، ان کا دروازہ سب کے لیے کھلا رہتا، جو بھی آتا ان سے مل کر ان کی قناعت پسندانہ زندگی کا راگ الاپتا جاتا۔

اسی زمانہ میں ان کے بھتیجے امتیاز حسین خاں مرحوم جامعہ سے بی۔ اے کرکے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے کی فکر میں تھے، وہ پاسپورٹ کا انتظار کر رہے تھے، میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے بے تکلف ہوگئے، وہ اپنے خاندان والوں ہی کی طرح شکیل، مخلص، خلیق اور ملنسار تھے، ذاکر صاحب ہی کے ساتھ رہتے تھے، جب کبھی ان کو موقع مل جاتا میرے کمرہ میں چلے آتے اور دیر تک بیٹھے رہتے، انکے ساتھ کبھی ذاکر صاحب کی بڑی لڑکی سعیدہ بھی

آجاتیں، جو اس وقت چار پانچ برس کی محض ایک بچی تھیں، امتیاز مرحوم اپنے محبوب چچا کی گھریلو زندگی کی سادگی کا کبھی کبھی ذکر کرتے تو ہنس کر کہتے کہ سعیدہ کو شکایت ہے کہ ان کے گھر میں ڈرائنگ روم نہیں، فرش نہیں، قالین نہیں، اور کہتی ہیں کہ حیدرآباد میں چچا جان یعنی ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے یہاں بڑا اچھا ڈرائنگ روم ہے، بہت اچھے اچھے قالین ہیں، امتیاز مرحوم ہی سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں ایسا بھی ہوتا کہ ذاکر صاحب کے یہاں رات کو جو روٹیاں بچ جاتیں، صبح کو گھر والے ان ہی کا ناشتہ کرکے اکتفا کرلیتے، اس سے ذاکر صاحب کی عزت میرے دل میں اور بڑھ گئی، وہ چاہتے تو ان کو بڑی سی بڑی ملازمت مل سکتی تھی، لیکن ان کو جامعہ کی عسرت بھری زندگی ہی میں عشرت حاصل تھی، اور اسی عسرت بھری عشرت میں انکی شہرت اور عزت بڑھتی گئی، جامعہ کے لوگ خواہ اساتذہ ہوں یا طلبہ دونوں ان کو دیکھتے تو محسوس کرتے کہ وہ ایثار، اخلاق، محبت، شرافت، بےنفسی مستقل مزاجی اور اخلاص کے قطب مینار کو دیکھ رہے ہیں،

شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان کا دفتر بھی بڑا سادہ تھا، کمرہ میں فرش بچھا رکھا تھا، میز، کرسیاں نہ تھیں، فرش ہی پر بیٹھتے، ایک صندوق نما ڈسک پر جھک کر جامعہ کے کاغذات دیکھتے یا کچھ لکھتے رہتے، جو کوئی آتا اسی فرش پر بیٹھکر ان سے باتیں بھی کرتا، انھوں نے جامعہ ملیہ کے اندر بالکل مشرقی اور اسلامی طرز کی زندگی برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی، طلبہ فرش پر بیٹھکر کھانا کھاتے، البتہ کھانا تخت پر رکھا جاتا، یہ ایرانیوں کے کھانے کا طریقہ ہے، اس زمانہ میں تمام طلبہ کے سروں پر ٹوپیاں ضرور ہوتیں، ذاکر صاحب کسی موقع پر ننگے سر دکھائی نہیں دیتے اسی لیے اپنے طلبہ کو بھی ننگے سر دیکھنا نہیں چاہتے تھے، پانچوں وقت نماز کی بڑی پابندی کراتے، ہر ہوسٹل میں ایک بڑا کمرہ نماز باجماعت کے لیے ہوتا، جو پانچوں وقت بھرجاتا،

جامعہ ملیہ چھوٹے بچوں کی تربیت کے معاملہ میں پورے ہندوستان میں مشہور ہوگئی تھی، اس لیے ہندوستان کے ہر گوشہ سے بچے آکر وہاں جمع ہوگئے تھے، انکی نگرانی اس زمانہ میں ایک یہودی جرمن خاتون مس فلپسبورن کرتی تھیں، ذاکر صاحب کی ہدایت کے مطابق تمام بچے ان کو آپا جان کہا کرتے تھے، ہٹلر نے

جرمنی سے یہودیوں کو جلاوطن کیا تو وہ ہندوستان آگئی تھیں، یہاں ذاکر صاحب نے ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، رفتہ رفتہ جامعہ ملیہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی گئیں، سب سے بہت ہی اخلاق سے پیش آتیں، ایک روز میں بھی بچوں کے مکتب کے سامنے کھڑا ہوکر ان سے باتیں کررہا تھا کہ یکایک میں نے دیکھا کہ ایک بظاہر گنوار لڑکا ایک صاف ستھرے لڑکے کو ایک درجے سے دھکا دیتے ہوئے باہر نکل آیا اور اس کو پٹک کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا، مجھ سے دیکھا نہ گیا، میں نے گنوار لڑکے کو ڈھکیل کر صاف ستھرے لڑکے کو اسکی مار سے بچالیا، میں نے آزردہ ہوکر مس فلپسبورن سے کہا کہ

Why do you allow such street urchins to came to classes

یہ سنکر مس فلپسبورن برہم ہوگئیں اور انکے چہرہ کا رنگ سرخ ہوگیا، مجھ سے مخاطب ہوکر بولیں

Dont say like That. We shall try to acclamatise him in our envesonment

اس غیر ملکی عورت کی زبان سے یہ سنکر مجھکو بڑی ندامت ہوئی، میں ان سے معذرت خواہ ہوا، اسی سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میں ہندوستان میں آکر ہندوستانی بچوں سے بہت متاثر ہوئی ہوں، ان کو جرمنی کے بچوں سے سیکڑوں گنا زیادہ ذہین پایا، اگر ان کی صحیح تربیت ہوتی رہے تو وہ یورپ کے بچوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوسکتے ہیں، یہ سن کر میں خوش ہوا لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جامعہ ملیہ کی تربیت سے تو وہ بہت جلد راہ راست پر آجاتے ہیں لیکن جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے ہیں تو پھر پہلے ہی جیسے کورے ہوکر لوٹتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ انکے گھر کا ماحول بہت ہی مختلف ہوتا ہے،

جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب کی کوشش یہی رہی کہ ہندوستانی بچے جو جرمنی کے بچوں سے سیکڑوں گنا زیادہ ذہین ہوتے ہیں، صحیح تربیت پاتے رہیں، اور ان کے لیے ملک کی نئی آب و ہوا سازگار ہوتی رہے، انکی یہ کوشش اس زمانہ میں کامیاب رہی، وہاں کے بچے دور سے پہچان لیے جاتے کہ یہ جامعہ کے ہیں،

ذاکر صاحب کی وضعداری یہ بھی تھی کہ وہ طلبہ کے ہوسٹلوں اور اساتذہ کے گھروں میں جاکر ان سے

بے تکلفانہ گفتگو کرتے میرے کمرہ میں بھی کئی بار آئے، ایک بار میں سی آف اینڈریوز کی تصنیف ذکاء اللہ کا مطالعہ کر رہا تھا، وہ تشریف لائے، تو یہی کتاب موضوع بن گئی، میں نے عرض کیا کہ کیا مناسب ہوگا اگر میں اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کر دوں، جواب میں فرمایا، پہلے ترجمہ کے ناشر کو ٹھیک کر لیجئے پھر ترجمہ شروع کیجئے، ورنہ ترجمہ کے بعد کوئی ناشر نہیں ملا تو محنت رائگاں جائیگی، پھر بزرگانہ شفقت سے کہا کہ کچھ لوگ پڑھے ہوتے ہیں، کچھ صرف لکھے ہوتے ہیں، اور کم لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں، آپ پڑھے لکھے ہونے کی کوشش کیجئے، پڑھیے زیادہ لکھیے کم، پڑھنا لکھنا چھپنے کے لیے نہ ہو، چھپنے کے بعد غلط راستے پر پڑ جانے کا امکان زیادہ بڑھ جاتا ہے، جو چھپتے ہیں وہ لکھتے تو زیادہ ہیں لیکن پڑھتے کم ہیں، یہ بات دل میں اب تک بیٹھی ہے، ذاکر صاحب اپنی گفتگو میں تم کہہ کر بہت کم لوگوں سے مخاطب ہوتے، زیادہ تر آپ ہی ان کی زبان سے نکلتا، ایک اور موقع پر اکبر پر گفتگو آگئی، میری زبان سے اس کے متعلق کچھ سخت باتیں نکل گئیں جن کو ذاکر صاحب نے ہنس کر سنا، پھر فرمایا کہ اکبر کو برا کہنا تو آسان ہے لیکن اس کو سمجھنا مشکل ہے، ہندوستان کی تاریخ میں اسکی ذات رواداری، سیر چشمی اور فراخدلی کا بہت بڑا تجربہ ہے، اسکا مطالعہ اسی تجربہ کی روشنی میں کرنا چاہیے، اس سے غلطیاں اور بے اعتدالیاں ضرور ہوئیں لیکن اس کا یہ تجربہ سیاسی نفسیاتی اور عمرانی تجزیہ کا مستحق ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے تجربہ میں ناکام رہا،

جامعہ کے قیام کے زمانہ میں ایک بار مجھ پر ملیریا کا سخت حملہ ہوا، اور اپنے کمرہ میں پڑا تھا کہ ایک کملی اوڑھے فقیر میرے کمرہ میں داخل ہو گیا، اور مجذوبانہ باتیں شروع کر دیں جن سے میں مرعوب ہو گیا، میں نے اس کو ٹالنے کی خاطر دو پیسے دیے، لیکن اس نے فضا میں ان دو پیسوں کو کچھ اس طرح اچھالا کہ میری نظروں سے غائب ہو گئے، اور وہ بولا "میں تمھارے پاس بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں"، میں گھبرا گیا اور مودب ہو کر دو روپے نذرانے کے طور پر پیش کیے، لیکن اس نے ان دو روپیوں کو بھی فضا میں غائب کر دیا، اور چیخا "میں تمھارے ان دو روپیوں کے لیے نہیں آیا ہوں"، میں اور بھی پریشان ہوا، میرے بکس میں ایک دس روپے اور

پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ تھے میں نے کچھ اور نذرانہ پیش کرنا چاہا، سوچنے لگا کہ پانچ کا نوٹ دوں یا دس کا، پھر پانچ کا نوٹ لیکر اس کو مودبانہ پیش کیا، وہ بولا "تو اس کشمکش میں تھا کہ پانچ کا دوں یا دس کا، ایسی کشمکش کا نذرانہ لیکر میں کیا کروں گا"، اور پھر اس نے فضا میں پانچ روپے کا نوٹ اس طرح اچھالا کہ میری نظر سے غائب ہو گیا، میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تو میں نے دس روپے کا نوٹ بھی اس کے حوالے کر دیا جس کو اس نے ہنسکر لے لیا، وہ بیڑی پی رہا تھا، اس کی راکھ میرے منہ میں یہ کہکر ڈالدی کہ یہ برکت کی راکھ ہے، یہ راکھ شکر کی ایسی میٹھی تھی، پھر وہ اٹھا اور یہ کہکر چلا گیا کہ جس ڈبہ سے تو نے روپے نکال کر دیے ہیں وہ تجھ کو کل صبح روپیوں سے بھرا ملے گا"۔ یہ کہکر غائب ہو گیا، صبح کو میرا ڈبہ بھرنے کے بجائے بالکل خالی تھا، میرے اس طرح لٹ جانے کی خبر جامعہ میں پھیلی تو سب ہنسے، میں بیمار تھا ہی، ذاکر صاحب میری عیادت کے لیے آئے، تو میرے لٹ جانے پر یہ کہکر ماتم پرسی کی، حضرت: یہ دہلی ہے، جہاں درویش ضرور رہا کرتے ہیں، لیکن یہاں درویش نما بدمعاش بھی ہیں، پھر فرمایا کہ آپ کا یہ نقصان رائگاں نہ جائے گا، اسکے پیچھے ایسے فوائد ہیں جن سے آپ کو سنبھل کر زندگی بسر کرنے میں مدد ملے گی، ان کی یہ نصیحت بڑی کارگر ہوئی،

اسی زمانہ میں جامعہ کے اساتذہ میں مولانا شرف الدین ٹونکی بھی تھے، جو ذاکر صاحب کے استاد بھی رہ چکے تھے، ذاکر صاحب ان کا بڑا احترام کرتے، ان کے سامنے مودب بیٹھتے، بلند آواز میں گفتگو نہ کرتے، مولانا شرف الدین ٹونکی کے مزاج میں بڑا اکھڑپن تھا، جو بات انکی زبان پر آتی وہ کہے بغیر نہ رہتے، حق اور صداقت کا اعلان کرنے میں بہت بے باک تھے، کسی سے انکی نہ بنتی، لیکن ذاکر صاحب کی وجہ سے اور لوگ بھی انکے احترام میں فرق نہ آنے دیتے، ایک بار بچوں کی طرف سے سالانہ عید میلاد النبی کی دلچسپ تقریب تھی، اسکی صدارت مولانا ہی کرنے والے تھے، جامعہ کے اساتذہ کے علاوہ بیرونی مہمانوں میں جناب ڈاکٹر لودی کریم حیدر بھی آئے ہوئے تھے، جو مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے، لیکن اس وقت وہ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے

رکن تھے، وہ ذاکر صاحب کے یہاں برابر آتے جاتے رہتے، انکی بیوی جرمن تھیں لیکن اسلام قبول کرلیا تھا، وہ صاحب قسم کے آدمی ہونے کے باوجود اسلامی جذبات رکھتے تھے، اس لیے اپنی بیگم کے ساتھ مذہبی جلسہ میں شریک ہوا کرتے تھے، وہ اپنی بیگم اور لڑکی کے ساتھ بچوں کی عید میلاد النبی کی تقریب میں آئے تو مسن پلسورن نے انکی پیشوائی کی، یہ تینوں خواتین جلسہ گاہ کے کنارے کرسیوں پر بیٹھیں، ان کا لباس یورپی تھا، مولانا شرف الدین ٹونکی ان میموں کو دیکھکر بگڑ گئے اور غصہ میں ذاکر صاحب سے کہا کہ میں ایسی تقریب کی صدارت نہیں کرتا جہاں نیم برہنہ عورتیں موجود ہوں، یہ سن کر ذاکر صاحب بہت پریشان ہوئے، لیکن وہ اپنی معزز خواتین مہمان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے، انکی پریشانی کو مولانا اسلم جیراجپوری نے دور کیا، پہلے تو انھوں نے مولانا شرف الدین ٹونکی سے کہا "مولانا، اگر آپ نیم برہنہ عورتوں کی موجودگی میں صدارت کرنا پسند نہیں فرماتے تو آپ اجازت دیں تو کسی اور کو صدر منتخب کر لیا جائے، مولانا ٹونکی نے صدارت چھوڑنا پسند نہیں کیا، انکی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مولانا اسلم جیراجپوری نے کہا کہ اگر آپ صدارت کی جگہ پر اس طرح بیٹھیں کہ آپ کی نظریں ان نیم برہنہ نامحرم عورتوں پر نہ پڑیں تو میرا خیال ہے کہ شرعی قباحت دور ہوجائیگی، مولانا شرف الدین ٹونکی نے فرمایا کہ یہ مشورہ صحیح ہے، اور پھر وہ صدارت کے لیے آگے بڑھ گئے، میں دوسرے دن مولانا اسلم جیراجپوری کے گھر پر حاضر ہوا تو اس واقعہ کا بھی ذکر آگیا، مولانا نے فرمایا کہ مولانا شرف الدین ٹونکی کی وجہ سے کبھی کبھی ایسی چپقلش پیدا ہوتی رہتی ہے، کہنے لگے کہ ایک بار بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لائیں، وہ برقعہ میں تھیں، اساتذہ ایک صف میں انکی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے، بیگم صاحبہ تشریف لائیں تو ذاکر صاحب نے سب سے تعارف کرانا شروع کیا، تعارف کے بعد بیگم صاحبہ ہاتھ بھی ملاتیں، انھوں نے جب مولانا شرف الدین ٹونکی کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو وہ دو ٹوک بولے میں نامحرم عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا، اور یہ کہکر اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا، بیگم صاحبہ کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا کہ میں نے ان سے یہ کہکر ہاتھ ملا لیا کہ میں بھی عالم ہوں، لیکن میں نامحرم عورتوں سے ہاتھ ملا لیتا ہوں، یہ سن کر بیگم صاحبہ ہنسنے لگیں، ذاکر صاحب بھی

اس طرح محجوب نہ ہوئے،

اسی زمانہ میں دہلی میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی تھی، اسکے صدر جے پور ریاست کے وزیر تعلیم ہوئے، اس کے مستقل سکریٹری پرنسپل سیشادری تھے، جو اس وقت غالباً اجمیر پرنس کالج میں تھے، مجلس استقبالیہ کا کوئی صدر نہ ہوا تھا، اس کے انتخاب کی تاریخ کا اعلان ہوا، تو جامعہ والوں کی خواہش ہوئی کہ اسکے صدر ذاکر صاحب ہوں، مجلس استقبالیہ کی رکنیت کی فیس ایک روپیہ تھی، ہم تمام لوگ اسکے رکن بن گئے، انتخاب کے مقابلہ میں ذاکر صاحب بھاری اکثریت سے صدر منتخب کرلیے گئے، انھوں نے اجلاس میں اپنا خطبہ پڑھا تو ہر طرف اسی کی دھوم تھی، جے پور کے وزیر تعلیم کا خطبہ بہت پھیکا پڑ گیا، دہلی کے اخبار میں ذاکر صاحب کا خطبہ بڑے آب و تاب سے شائع ہوا اور اس پر ہندوستان ٹائمس اور دوسرے اخبار والوں نے اداریے بھی لکھے،

جامعہ میں میرے قیام کے دوران خالدہ ادیب خانم بھی وہاں اپنے توسیعی خطبات دینے آئیں، ان کے ٹھہرنے کا انتظام ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے گھر پر کیا گیا، پروفیسر محمد مجیب ان کے یہاں انکے خطبات پر نظر ثانی کرنے کے لیے برابر جاتے، میں بھی ایک بار انکے ساتھ گیا اور خالدہ ادیب خانم کے ساتھ دن کا لنچ بھی کھانے کا اتفاق ہوا، بڑی باوقار اور متین خاتون تھیں، انگریزی بہت بے تکلف بولتی تھیں اور جوابات کہتیں اس میں وزن اور وقار ہوتا، ان کا پہلا توسیعی لکچر جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں ہوا، سامعین میں بہت سے مشاہیر تھے جن میں راجہ گوپال اچاریہ، بھولا بھائی ڈیسائی، گووند ولبھ پنت، سروجنی نائیڈو، سیتا مورتی، لودی کریم حیدر کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں، ذاکر صاحب ان سب کی پیشوائی میں مشغول تھے، ان مشاہیر سے انکے ملنے اور باتیں کرنے کا کچھ ایسا انداز ہوتا کہ وہی ان سب پر بھاری نظر آتے ہیں اور شاید اس وقت بھی فضا میں یہ آواز گونج رہی تھی کہ کہ آگے چل کر ہندوستان کا یہ شاہین ان سب سے سبقت لے جانے والا ہے،

اس زمانہ کا ایک واقعہ برابر یاد آرہا ہے، سینٹ اسٹیفن کالج میں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے معاشیات

توسیعی لکچر پنجاب یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر دے رہے تھے، پروفیسر مجیب اس میں شرکت کے لیے ایک تانگہ پر جا رہے تھے، تو میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا، قرول باغ سے سینٹ اسٹیفن کالج تک پورے تانگہ کا کرایہ اس وقت صرف چھ آنے پیسے تھے، پروفیسر مجیب جامعہ میں نسبتاً خوشحال زندگی بسر کرتے تھے، ان کے والد جناب محمد نسیم صاحب لکھنؤ کے بہت ہی مشہور وکیل تھے، وہ انکی مالی امداد کرتے رہتے، اس لیے ان کو روپے پیسے کی تنگی نہ تھی، پروفیسر مجیب کے ساتھ میں بھی کالج پہنچکر لکچر سننے میں مشغول تھا کہ ذاکر صاحب تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہاں پہنچے، اور پیچھے بیٹھکر لکچر سننے لگے جب لکچر ختم ہوا تو وہ لوگوں سے ملنے ملانے لگے، پھر مجیب صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ مجھکو بھی اپنے ساتھ تانگہ پر لیتے چلیں، سب سے مل کر ہم تینوں رخصت ہوئے، تو ایک تانگہ چھ آنے میں طے ہوا، ذاکر صاحب نے آگے بیٹھنا پسند کیا، مجیب صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھے، ذاکر صاحب بولے کہ میں دیر کر کے لکچر میں پہنچا، اس لیے کہ میرے پاس اتنے دام نہ تھے کہ میں تانگہ کا کرایہ دیتا، ایک صاحب موٹر پر گذر رہے تھے تو میں ان ہی کے ساتھ بیٹھکر یہاں چلا آیا، واپسی کے بھی دام نہ تھے، اس لیے آپ کو روک رکھا، یہ سنکر مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی کہ خدمت و ایثار کا یہ پیکر کیسی تنگی کی زندگی بسر کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر کیا معلوم تھا کہ دہلی کی ان ہی سڑکوں پر اس مرد فقیر کو وہ اعزاز حاصل ہوگا جو کسی ہندوستانی کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہو سکتا ہے۔

ذاکر صاحب کا معمول تھا کہ وہ صبح کو قرول باغ کی پہاڑی پر جا کر ہوا خوری کرتے، ان کے ساتھ پروفیسر عاقل بھی ہوتے، ایک دو بار میں بھی ساتھ رہا، اسی پہاڑی کے نیچے جھاڑیاں تھیں، جن میں وائسرائے اور وائسرائین کی شہسواری کے لیے راستے بنے ہوئے تھے، وائسریگل لاج سے دونوں یہاں آکر ہوا خوری کرتے، ذاکر صاحب کا کبھی ان سے آمنا سامنا بھی ہو جاتا، ان کو کیا خبر تھی کہ ہوا خوری کرنے والا یہ پیدل ان ہی کی طرح شاہ بن کر وہاں متمکن ہوگا جہاں اسوقت ہندوستان کا کوئی پرند پر نہیں مار سکتا تھا۔

میں چھ مہینے جامعہ میں رہ کر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی طلبی پر دار المصنفین جنوری ۱۹۳۵ء میں آگیا، اُس وقت سے ابتک اس کا ادنی خدمت گذار بنا ہوا ہوں جب میں جامعہ ملیہ سے دار المصنفین کے لیے چلا تو ذاکر صاحب کی طبیعت کی شرافت، اخلاق کی پاکیزگی اور بے سر و سامانی میں مفید کام انجام دینے کی ہمت و پامردی کے بارے دا ہوار وانہ ہوا، ان کے اخلاص، جذبۂ ایثار، انکی فطری ملنساری، نرمی اور ملائمت کو نہ صرف جامعہ ملیہ کا بلکہ ملک و ملت کا راس المال سمجھنے پر مجبور رہتا، دار المصنفین کی صحبتوں میں ان ... کا ذکر برابر رہتا، میرے دار المصنفین آنے کے فوراً ہی بعد سید صاحب خالدہ ادیب خانم کی ایک لکچر کی صدارت کے لیے جامعہ ملیہ تشریف لے گئے، جہاں اکثر و بیشتر ذاکر صاحب ہی کے ساتھ قیام کرتے، واپسی کے بعد ذاکر صاحب کے گوناگوں اوصاف کا ذکر بڑے لطف و لذت سے کرتے، ذاکر صاحب کو بھی دار المصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، جب جامعہ قرول باغ کی عمارتوں میں کٹھن منزلوں سے گذر رہی تھی تو وہ اُس وقت دار المصنفین کی ترقی اور سرگرمیوں کو جامعہ کے لوگوں کے سامنے ایک اچھی عملی مثال کی طرح پیش کرتے، میرے دار المصنفین آنے سے پہلے ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کے چندے وصول کرنے کے لیے دو بار اعظم گڈھ آئے اور دار المصنفین ہی میں قیام کیا، مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کو چندے وصول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی، انھوں نے بڑی بڑی رقمیں ذاکر صاحب کو دلوائیں، جن کا اعتراف ذاکر صاحب آخر آخر وقت تک کرتے رہے، وہ دار المصنفین میں آکر بہت بے تکلف ہو جاتے، کھری چارپائی پر لیٹتے اور ایسے مل جل کر رہتے جیسے یہیں کے ایک فرد ہیں، مولانا مسعود علی صاحب ندوی دہلی جاتے تو ذاکر صاحب ان کو اپنے یہاں مہمان رکھتے، وہ ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ کو پٹھانی کہتے، ان کا بیان ہے کہ کھانے کے وقت ذاکر صاحب اپنی مشغولیتوں کی بنا پر گھر پر نہ ہوتے تو پٹھانی پردے کی آڑ میں سے سینی پر کھانا رکھکر انکو بڑھا دیتیں، وہ کھاتے، اللہ کا شکر ادا کرتے اور پھر سینی خود ہی بڑھا دیتے۔ ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ شروع ہی سے

گھریلو خاتون بن کر چراغ خانہ بنی رہیں، انھوں نے اپنی یہ وضعداری ذاکر صاحب کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی قائم رکھی،

۱۹۳۶ء میں کابل کے مشہور شاعر سرور خاں گویا ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئے، وہ دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ کے مشاہیر سے ملتے ہوئے دار المصنفین اعظم گڈھ آئے، اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا "میں نے ہندوستان میں حسین ترین آدمی ڈاکٹر ذاکر حسین کو پایا"، ہم لوگوں نے بھی اسکی تائید کی۔

میں نے دار المصنفین کے گوشۂ عافیت میں ذاکر صاحب کی خوبیوں کی یادوں کا چراغ اپنے دل میں روشن رکھا، گو اس کا بھی احساس رہا کہ ذاکر صاحب کے میرے جیسے عقیدتمند ہزاروں ہونگے، اس لیے جامعہ سے آنے کے بعد وہ مجھے بھول چکے ہوں گے، ۱۹۳۵ء کے بعد معلوم نہیں کتنے سیاسی انقلابات آئے، ۱۹۳۵ ایکٹ، ہندوستان چھوڑو ہنگامے پاکستان تحریک، اسٹفورڈ کرپس تجاویز، ہندو مسلمان فسادات، کانگریس لیگ کے جھگڑے سے ہندوستان کا ڈھانچہ بدل رہا تھا، ان تمام ہنگاموں میں ۱۹۴۷ء تک ذاکر صاحب کی مقبولیت اور محبوبیت میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوتا گیا، ہندو اور مسلمان دونوں ان پر اعتماد کرتے اور ان کے اخلاق و کردار کو مثالی نمونہ سمجھتے رہے، ۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی متاثر ہوئی، تقسیم ہند کے بعد سے ہندوؤں کا اعتماد ہندوستان کے مسلمانوں پر سے جاتا رہا کیونکہ پاکستان کے حق میں ووٹ دینے میں وہی آگے آگے تھے، اس بے اعتمادی کے طوفان میں مسلم یونیورسٹی کی کشتی بھی منجدھارے میں پڑ گئی، اس وقت ارباب بصیرت کی نظر ذاکر صاحب کی طرف اٹھی، کہ وہی اب اس کشتی کے کھیویا صحیح معنوں میں ہو سکتے ہیں، حکومت کو بھی ان پر اعتماد تھا، اس لیے وہ ۱۹۴۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنا دیے گئے، مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کرنا اور خار دار بستر پر لیٹنا دونوں برابر ہیں، وائس چانسلری کے زمانہ میں پہلی دفعہ ذاکر صاحب تنقیدیں سننے میں آئیں، ان میں عقلیت پسندی بھی تھی اور مذہبیت بھی، وہ اپنے خاندان

اور گھر کے ماحول کی وجہ سے ایک اچھے قسم کے مسلمان تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کے ہندوستان میں جب ان پر ذمہ داریاں عائد کی گئیں تو وہ اچھے قسم کے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند مسلمان بھی ہونا چاہتے تھے، وہ بھی ہندوستان کے عام مسلمانوں کی طرح اس ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانان ہند کا مقام ہندوستان میں ہو تو کیا ہو، ملک کے بدلے ہوئے حالات میں ان کو ایک علحدہ قوم تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا، اور نہ ان میں اتنی قوت و صلاحیت باقی رہ گئی تھی کہ وہ حکومت سے ٹکر لے کر اپنی جداگانہ قومیت کو تسلیم کرا سکتے تھے، وہ نہ خود مختار ہو سکتے تھے اور نہ ذہنی طور پر کسی کے زیر اقتدار ہو کر محض خاموش اور غیر متحرک شہری بننا پسند کرتے تھے، ذاکر صاحب ان الجھنوں میں جس نتیجہ پر پہنچے تھے اس کا اظہار انھوں نے اس تقریر میں کیا جو ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب میں جا کر کی، انھوں نے فرمایا :-

"اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہو، جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گذارنی ہے اور اپنی مثال اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے، اسی طرح مسلمانان ہند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیات طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے ہم وطنوں کے دل میں ان کے لیے جگہ پیدا ہو، زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جن کے یہ حامل ہوں عام ہندی زندگی کو متاثر کریں اور ہم جو رحمۃ للعالمین کے نام لیوا ہیں، اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے مثال اور رحمت کا کام دیں۔"

یہ کوہ سینا کا کوئی وعظ نہیں، بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صحیح لائحہ عمل ہے، اور اسی نصب العین پر عمل کرنے میں ان کی اجتماعی زندگی کی نجات ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان زندگی کے

ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں نہ افکار کی بلندی، نہ کردار کی خوبی، نہ حیات طیبہ اسلامیہ کی اعلیٰ قدریں ہیں، ان پر صرف یہ خوف غالب ہے کہ کہیں ہندوستانی قومیت کے سیلاب میں ان کا وجود بالکل مٹ نہ جائے۔ یہ خوف بیجا بھی نہیں، تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی حکومت کا تو نہیں لیکن یہاں کے اکثریتی فرقہ کے جذبات یہ ہیں کہ مسلمانوں کو جو کچھ لینا تھا وہ پاکستان کی شکل میں لے چکے ہیں، ہندوستان میں اب وہ کسی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی رعایت کے مستحق نہیں، ان جذبات کا اظہار جن مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے، اس سے مسلمان حکومت کی یقین دہانی کے باوجود اپنے کو ایک آزاد جمہوریہ کا آزاد شہری تصور کرنے کے بجائے ایک مجبور اور بے بس اقلیت سمجھتے ہیں، اور ملک میں آئے دن کے بلووں میں ان کا خون جو پانی کی طرح بہتا رہتا ہے، اس سے ان کا خوف بڑھتا جاتا ہے کہ ان کا تہذیبی وجود کہیں بالکل ختم نہ ہو جائے۔

ذاکر صاحب کو مسلمانوں کے اس خوف کا احساس رہا، وہ بہار کے گورنر اور حکومت ہند کے نائب صدر ہونے سے پہلے کاشی ودیا پیٹھ میں مدعو کیے گئے تو وہاں انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیگا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے، ممکن ہے کہ بعض نیک نیت اور انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو، مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے، آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کردوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں

تنگ نظری اور آپس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائیگا

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما گلستان میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیش کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں انکی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔" (یادوں کی دنیا ص ۲۱۱-۲۱۰)

لیکن اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کرتے رہے کہ قومیت اور اسلامیت ایک دوسرے کی ضد اور نقیض نہیں، بلکہ ان کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہونی چاہیے، جامعہ ملیہ میں انکی ساری سرگرمیوں کا محور یہی رہا کہ وہ مسلمانوں کی آیندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کریں جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھر جائے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جانے، وہ اس کا اظہار برابر کرتے رہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دیگی، اور ہندستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کریگی، اور آزاد ہندستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ وہ سمجھتے رہے کہ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور

میں یہ تصور محض خواب و خیال ہے لیکن وہ ہمت، اخلاص، محنت اور استقلال سے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتے تھے۔

گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح انکی بھی خواہش رہی کہ آزاد ہندوستان میں باہمی دل آزاری اور بیزاری کے بجائے باہمی رواداری اور یگانگت ہو، اسلامیت اور قومیت کا حسن امتزاج ہو، اسی امتزاج کی خاطر ان سے بعض ایسی باتیں عمل میں آجاتی تھیں جن سے ان پر بڑی نکتہ چینیاں ہونے لگتی تھیں، وہ جو رواداری چاہتے تھے، اس کے لیے ہندوستان کا مزاج ابھی نہیں بنا تھا، وہ خاندانی طور پر اچھے قسم کے مسلمان تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ رہ چکے تھے، اس لیے مسلمان ان میں اسلامیت چاہتے تھے، جب وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے لگے تو حکومت اور اکثریتی فرقہ دونوں ان عہدوں کا معاوضہ انکی بے داغ قومیت کی شکل میں چاہتے تھے اور وہ بھی قومیت ایسی ہو جس کا معیار انھوں نے خود قائم کیا ہے، ذاکر صاحب کو اپنے عہدوں کا معاوضہ ادا کرنا پڑا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اس کے ادا کرنے میں ان کو گھٹن محسوس ہوتی رہی، کیونکہ انکے سامنے ہندوستانی قومیت کا جو تخیل تھا، وہ تقسیم ہند کے بعد باقی نہ رہا، مسلمان انکو مسلمان دیکھنا چاہتے تھے، ہندو انکو ہندوستانی حکومت کا ایک وفادار عہدیدار کے علاوہ کچھ اور دیکھنا پسند نہ کرتے تھے کوئی انکے حسن امتزاج کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھنے کو تیار نہ تھا، وہ سچے مسلمان اور پکے ہندوستانی بننے کا عزم رکھتے تھے، اس عزم کو اپنے اخلاص اور نیت کی پاکیزگی سے عمل میں لاکر ایک مثالی نمونہ پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن یہ راہ ہندوستان کی موجودہ فضا میں بڑی خار دار تھی، انھوں نے اسلامیت اور ہندوستانی قومیت کے حسن امتزاج کا جو خواب دیکھا تھا، انکے اخلاص، محنت اور استقلال کے باوجود حقیقت میں تبدیل نہ ہو سکا، جامعہ کی زندگی میں وہ بے داغ ہیرو بنکر رہے، لیکن اپنے بڑے سے بڑے عہدوں کے زمانے میں رہین ستم ہائے روزگار بنگئے، معلوم نہیں انکو اپنے آخری زمانے میں کونسی زندگی قابل ترجیح نظر آتی تھی، جامعہ ملیہ کی عسرت بھری زندگی یا راشٹرپتی بھون کی عشرت بھری فضا۔

لیکن انکی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے عہدوں کے باوجود ہر زمانہ میں

ذاکر صاحب ہی رہے، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو کچھ عرصہ کے بعد ان پر نکتہ چینی ہونے لگی کہ وہ جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ نہیں رہے، بلکہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے، ان پر ہندو نوازی کا بھی الزام آیا، ان پر یہ بھی اعتراض ہوا کہ طالبات کی بے پردگی اور آزادی ان ہی کے دور سے شروع ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی پاکستان تحریک کا بڑا مرکز بنی ہوئی تھی، قائد اعظم محمد علی جناح اس کو اپنا Arsenal کہتے تھے، علی گڑھ کے اس رول کو حکومت اور اسکے ہمنوا فراموش کرنے کے لیے تیار نہ تھے، سیکولرزم کی آڑ میں اس کی اصلی حیثیت کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تو اس وقت اس کو ذاکر صاحب اور صرف ذاکر صاحب ہی بچا سکتے تھے۔

انھوں نے حکومت کی تھوڑی سی فراخداری کر کے علی گڑھ کو مجموعی حیثیت سے بچا لیا، حکومت کی یہ فراخداری کچھ لوگوں کو پسند نہ آئی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا، ذاکر صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ اس دار وگیر کے زمانے میں یونیورسٹی کے سالانہ بجٹ کو پندرہ لاکھ سے پچاس لاکھ تک پہنچا دیا، وہاں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ پر تحقیق کا شعبہ اور ادب اردو کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم ان ہی کی قائم کی ہوئی ہے، تار کے بنگلے کے پاس اس وقت ایک بہت ہی خوبصورت مسجد ہے، یہ ان ہی کی بنوائی ہوئی ہے، انھوں نے اس کا نقشہ ایک جرمن انجینیر کو بلا کر تیار کرایا، پھر خود کھڑے ہو کر اسکی تعمیر کی نگرانی کرتے تھے، یہ جب بن گئی تو اکثر اس میں آکر نماز باجماعت ادا کرتے تھے، یہاں ان کی خوش مذاقی کا اظہار چمن بندی اور طراحی میں بھی ہوا، میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، تو سوئمنگ باتھ کے پاس جو ایک لان ہے، وہیں کچھ پھول نظر آتے تھے، اور ہر جگہ زمین اوسر پڑی تھی، ذاکر صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں یونیورسٹی کے احاطہ کو چمن زار بنا دیا، وہ گلاب اور بوگن ولیا کے عاشق زار تھے، یونیورسٹی میں گلابوں کے جا بجا چمن لگائے، جن میں نارنجی، ارغوانی، سیاہ، سبز اور فاختئی رنگ کے بھی گلاب دیکھنے میں آئے،

ایس ۔ ایس ہال کے باہر کے کمروں کی دیواروں کو بوگن ولیا کی باڑھ سے لاد دیا، اور جب ان کے پھول کھلتے ہیں یونیورسٹی لالہ زار بنجاتی ہے۔ ذاکر صاحب کے بوگن ولیا کے اس شغف کو دیکھکر یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر جناب حبیب الرحمن صاحب (سابق پرنسپل ٹریننگ کالج) نے اس کی ایک قسم تیار کی جس کا نام ذاکر یا نار رکھا، اس میں گلابی اور نارنجی رنگوں کی حسین اور لطیف آمیزش تھی، ذاکر صاحب یونیورسٹی کو بھی اسلامیت کے گلابی اور ہندوستانیت کے نارنجی رنگوں کی حسین اور لطیف آمیزش کا ایک بوگن ولیا بنانا چاہتے تھے، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کی مسموم فضا اس کے لیے سازگار نہ ہوسکی، اکثریت و اقلیت کے فکر و نظر کے تصادم سے وہ اپنے خواب کو حقیقت کا جامہ یہاں بھی نہ پہنا سکے، اور ان کی بہت سی تمنائیں اور آرزوئیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی ان کی وائس چانسلری کی مدت ختم ہوگئی، مگر وہ اور ان کے ساتھ بہت سے لوگ خوش تھے کہ یونیورسٹی انقلاب کی زد سے محفوظ رہ گئی، گو کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی بہت سی اصلاحات سے ناخوش بھی تھے۔

یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانہ میں ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی، لیکن اس زمانہ میں دار المصنفین کے لوگوں میں سے کوئی بھی علی گڑھ جاتا تو وہ اپنے دیرینہ اخلاق سے پیش آتے، ایک بار مولانا مسعود علی ندوی مرحوم اور شاہ معین الدین صاحب ندوی دونوں ساتھ وہاں پہنچے، تو ذاکر صاحب نے ان کی ایک پر تکلف دعوت کی، شاہ معین الدین صاحب انجمن ترقی اردو کے رکن ہونے کی حیثیت سے علی گڑھ برابر جاتے رہتے، ذاکر صاحب ان کو جلسہ گاہ میں لانے کے لیے اپنی موٹر بھیجتے اور ان کی قیام گاہ پر آکر دیر تک پر لطف باتیں بھی کرتے رہتے۔

۱۹۵۹ء میں جب وہ بہار کے گورنر تھے، تو میں پٹنہ جا کر گورنر ہاؤس میں ان سے ملا، اتنے طویل وقفہ کے بعد کی ملاقات کے بعد خیال تھا کہ وہ مجھے بھول چکے ہوں گے، لیکن میرا تعلق دار المصنفین سے بھی ہو چکا تھا، اس لیے ان سے ملا، تو ان میں جامعہ ملیہ ہی کے زمانہ کی خاکساری، ملنساری، محبت اور شفقت پائی،

اور جب انھوں نے گفتگو شروع کی تو معلوم ہوتا تھا کہ قرول باغ کے مکان ہی میں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں، دار المصنفین کے تمام لوگوں کی خیریت پوچھی، اس کی علمی سرگرمیوں کی تعریف کی، سید صاحب کا وصال کراچی میں ہو چکا تھا، ان کا ذکر دیر تک کرتے رہے، اور جب ان سے رخصت ہونے لگا تو گلے سے اس طرح لگایا جیسے اپنے کسی عزیز خاص کو رخصت کر رہے ہیں،

اس کے کچھ دنوں کے بعد انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کے وطن دیسنہ کو دیکھنے کا پروگرام بنایا، جہاں انکا بہت ہی مخلصانہ خیر مقدم کیا گیا، میں بھی اس موقع پر وہاں پہنچ گیا، جلسہ گاہ میں سپاسنامہ پڑھے جانے سے پہلے چار پانچ برس کے ایک ہریجن بچہ نے ان کو ہار پہنانا چاہا، اس کے ہاتھ ان کے گلے تک نہیں پہنچے تو انھوں نے اپنے اعلیٰ مرتبہ کا خیال کیے بغیر اس کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور گردن جھکا کر ہار پہن لیا، اس امتیاز پر اس ہریجن بچہ کا خاندان ابھی تک فخر کرتا ہے، سپاسنامہ کے جواب میں انھوں نے سید صاحبؒ کا ذکر دیر تک کیا، اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ جن چند بزرگوں نے انکی زندگی کا رخ موڑا ہے اُن میں ایک سید صاحب بھی ہیں، اس گاؤں میں اردو کا ایک بڑا اچھا کتب خانہ تھا، تقریباً دس بارہ ہزار کتابیں رہی ہوں گی، ذاکر صاحب کو یہ کتبخانہ بہت پسند آیا، میں نے اس میں خود گاؤں کے چند مشہور مصنفوں مثلاً سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابو ظفر ندوی اور سید نجیب اشرف ندوی وغیرہ کی تصانیف ان کو دکھائیں، تو فرمایا کہ جس گاؤں میں اتنے مشہور مصنف ہوئے ہیں اس پر ہندوستان کو فخر ہونا چاہیے، جلسہ کی تقریب ختم ہوئی تو انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کا مکان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے عرض کیا کہ وہاں جانے میں کچھ ایسی گندی گلیاں ملیں گی جہاں پر سے آپ کا گذرنا مناسب نہیں، فوراً جواب دیا کہ میں ہر زمانہ میں گورنر نہیں رہا ہوں، ایسی ہی گلیوں میں کھیلا کودا اور پلا ہوں، اور پھر میں ہی نے ان گلیوں میں انکی رہبری کی، ۱۹۴۷ء کے بعد یہ شاداب گاؤں ویران ہوتا چلا گیا، اس کے بیشتر باشندے پاکستان

چلے گئے، کتب خانہ کا قیمتی ذخیرہ گاؤں ہی میں رہ گیا، برابر ڈر لگا رہا کہ کہیں بلوے فساد میں یہ ضائع نہ ہو جائے، گاؤں کے سنجیدہ لوگ چاہتے تھے کہ اس کو پٹنہ منتقل کر کے خدا بخش خاں کی لائبریری کا ایک جزو بنا دیا جائے، لیکن وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کے ذریعہ گاؤں کی سیاست کا کھیل کھیلا کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہ کہیں منتقل نہ ہونے پائے، اسی کشمکش میں مولوی سید عبدالحفیظ ندوی صاحب ناظم کتب خانہ اور جناب عبدالقیوم صاحب نائب ناظم نے چپکے سے ایک خط ذاکر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ اس کو خدا بخش خاں لائبریری میں منتقل کرا دیں، ذاکر صاحب کی اندرونی خواہش پوری ہوتی نظر آئی، انھوں نے فوراً پٹنہ ڈویژن کے کمشنر کو ایک خط لکھا جس کو پاتے ہی کمشنر، ضلع کے کلکٹر اور دوسرے حکام دیسنہ پہنچ گئے، برسات کا زمانہ تھا، وہاں تک ٹرک جا نہیں سکتے تھے، لیکن انھوں نے سولہ بیل گاڑیوں پر کتابیں لدوائیں، اور پھر تھوڑی دور جا کر ٹرک پر رکھکر پٹنہ لے اڑے، گاؤں کی دوسری پارٹی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، یہ کتب خانہ اب دیسنہ بلاک کے نام سے خدا بخش خاں لائبریری کا ایک حصہ ہے،

مجھکو اس کی خبر ملی تو خوش تھا کہ ایک قیمتی ذخیرہ ایک اچھی جگہ محفوظ ہو گیا، لیکن ہم لوگوں نے جس ذوق و شوق سے اس ذخیرہ کو جمع کیا تھا، اس کا خیال آیا تو محسوس ہوا کہ اس گاؤں کی اب روح نکل گئی اور اب یہ صرف بے روح کا ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے، میں نے ذاکر صاحب کو اپنے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا اور یہ شعر بھی لکھ بھیجا۔

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاک نشیمن پر

ذاکر صاحب نے جو جواب لکھا اس میں گاؤں کی دوسری پارٹی کے ایک فرد کا خط بھی منسلک کر دیا جو بڑی بد تمیزی سے لکھا گیا تھا، کوئی دوسرا گورنر ہوتا تو اس کو پڑھ کر معلوم نہیں غصہ میں کیا کیا کارروائیاں کرنے پر آمادہ ہو جاتا، لیکن ذاکر صاحب کو شاید کبھی غصہ نہیں آیا، انکے مخالفین اور ناقدین

ان سے اشتعال انگیز باتیں بھی کرتے تو وہ ہنس کر ٹال دیتے، ان کی پوری زندگی پر شور رہی لیکن وہ کبھی کسی سے نہیں الجھے، کسی کو کوئی سخت خط نہیں لکھا، کسی سے ترشی سے نہیں بولے، اخباروں میں متنازع فیہ بیانات شائع نہیں کیے، ان پر غلط اعتراضات ہوئے تو اسکی تردید بھی نہیں کی، ان کے بد باطن ناقد ان سے ملتے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ لطف و کرم سے پیش آتے، اسلیے مشہور تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے زیادہ اپنے خبیث مخالفوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کرتے ہیں، کچھ بڑے بلکہ بہت بڑے لوگ ایسے بھی گذرے ہیں جو خبیثوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے ان کی خباثت میں اضافہ کر دینے ہی میں اصلی انتقام سمجھتے ہیں، ذاکر صاحب کے یہاں انتقام لینے کا تو کبھی کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوا ہے، لیکن وہ اپنے خبیث مخالفوں کو ہر قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رکھنے ہی میں اپنی فتح سمجھتے، میرے ہموطن نے ان کو جو بد تمیزانہ خط لکھا اس سے مجھکو بڑی ندامت ہوئی، لیکن ذاکر صاحب نے اپنی طبیعت کی بلندی سے عفو و درگذر سے کام لیا،

اسکے تھوڑے دنوں کے بعد ہی دہلی میں مولانا ابو الکلام آزاد کی یادگار میں نئی دہلی میں جو آزاد بھون تعمیر ہوا تھا، اسکا افتتاح راجندر پرشاد نے کیا، میں بھی اس میں انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے ممبر کی حیثیت سے شریک تھا، اسی زمانہ میں دہلی میں گورنرز کانفرنس ہو رہی تھی، اس تقریب میں وہ سب بھی مدعو تھے، جو ایک جگہ بٹھائے گئے، ان کے بیچ میں ذاکر صاحب بیٹھے نظر آئے، مجھکو بہت ہی بھلے معلوم ہوئے، سب میں وہی سب سے زیادہ شکیل، وجیہ، پر شکوہ اور باوقار نظر آئے، اور انکے ساتھ جب وہ کھڑے ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ یونانی سنگ تراشی کے آرٹ کا بہترین نمونہ نگاہوں کے سامنے ہے، جلسہ ختم ہوا تو وہ سب سے ایسے بے تکلفانہ انداز میں ملنے لگے جیسے وہ گورنر نہیں ہیں، مجھ پر نظر پڑی تو میری طرف بھی بڑھے اور بڑی شفقت سے فرمایا "کہئے کتبخانہ کے ہجر کا غم باقی ہے یا جاتا رہا، اور گاؤں والے کا کیا خیال ہے، پھر اس بد تمیزانہ خط کا بھی ذکر کیا، میں نے ان سے اپنی ندامت اور معذرت کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ ہم تمام لوگ آپکے ممنون ہیں کہ آپ نے ایک قیمتی ذخیرہ کو محفوظ کر دیا، ایسا نہ ہوتا تو یہ علمی دولت ضائع ہو جاتی،

(باقی)

ادبیات

آہ صدرِ وطن

از

جناب یحییٰ اعظمی

چھوڑ کر ایوانِ شاہی چھوڑ کر "قومی بھون"
جا بسے کس گوشۂ صحرا میں اے صدرِ وطن

سبزہ و گل ہیں حزیں، پژمردہ ہیں سرو و سمن
تیرے ماتم میں سیہ پوش آج ہے سارا چمن

چہرۂ زیبا ترا ہے آج پھولوں سے ڈھکا
یہ ردائے لالہ و گل ہے کہ ہے تیرا کفن

ہر طرف ہے صحنِ گلشن میں صفِ ماتم بچھی
ایستادہ ہیں جنازہ کے لیے سرو و سمن

یہ گل و غنچہ ہیں یا میت ہے دوشِ شاخ پر
خون سے رنگیں کفن ہیں یا گلوں کے پیرہن

لالہ و گل سے سجا کر جسمِ زیبا کو ترے
کس طرف لیجا رہے ہیں آج یارانِ وطن

زندگی بھر عاشقِ گل تو رہا پس بعد مرگ
بس گیا ہے بوئے گل سے سر بسر تیرا کفن

یہ وہ قومی حادثہ ہے وقفِ ماتم ہیں سبھی
قوم و ملت، علم و حکمت، دین و دانش، فکر و فن

تو دیارِ ہند میں وہ مردِ مومن تھا کہ آج
خونفشاں ہیں تیرے غم میں دجلہ و گنگ و جمن

درحقیقت یوسفِ گم گشتۂ ملت ہے تو
حق ہے گر سارا دیارِ ہند ہے بیت الحزن

دورِ حاضر میں یہ قدرت نے بخشا تھا کسے
یہ کمالِ حسن و خوبی یہ جمالِ علم و فن

اللہ اللہ فقر و شاہی کا یہ دلکش اجتماع
اللہ اللہ یہ وقار و سادگی کا بانکپن

اے کہ تھا رفقِ مجسم، پیکرِ لطف و کرم
ق
اے کہ تھا سر تا قدم مجموعۂ خلقِ حسن

تو نے پایا تھا یہ کس سے دلنوازی کا شعار
تو نے سیکھا تھا یہ کس سے لطف و رافت کا چلن

وہ چراغِ آگہی تھا تو کہ پرتو سے ترے
تھی فروغ انگیز قوم و ملک کی ہر انجمن

دین و دانش کا وطن میں وہ حسیں پیکر تھا تو
شاذ اٹھتا ہے جو زیرِ گنبدِ چرخِ کہن

ذاتِ والا کیا تھی؟ زیب و زینتِ "ایوانِ قوم"
روئے زیبا کیا تھا؟ اک شمعِ شبستانِ وطن

ذاکرِ ملت بھی تھا تو اجمل و آزاد بھی
تیرے اک پیکر میں سب اسلاف تھے جلوہ فگن

جس کے دورِ جام سے سرخوش تھا سارا میکدہ
اٹھ گیا صد حیف وہ رندِ خمستانِ کہن

آج ہر اک بزم و محفل میں اجالا جس سے تھا
بجھ گئی ہے آہ وہ ملت کی شمعِ انجمن

اے ترا حسنِ رقم تھا زینتِ شعر و ادب
اے ترا نقشِ قلم تھا چہرہ آرائے سخن

نامۂ والا کو اب کس کے بنائیں حرزِ جاں
خامۂ محزوں مرا لکھے کسے مخدومِ من

تیرے ماتم میں حزیں ہو کیوں نہ جانِ دردمند
تیرے غم میں ہر بنِ مو کیوں نہ ہو نالہ زن

آج آغوشِ لحد میں جا کے آرامیدہ ہے
کس سکوں سے اپنی دانشگاہ میں خوابیدہ ہے

مطبوعات جدیدہ

غالب نمبر (۲)

شاعر غالب نمبر :- مرتبہ جناب اعجاز صدیقی و ہمندر ناتھ صاحبان، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۶۲۰، قیمت [illegible]، پتہ مکتبہ قصر الادب، پوسٹ باکس نمبر ۲۵۲۶ بمبئی ۸۔

مشہور ادبی رسالہ شاعر نے اپنی روایتی شان کے مطابق غالب نمبر نکالا ہے، جو غالب کے متعلق متنوع اور رنگا رنگ مضامین پر مشتمل اور کئی حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ جو سب سے اہم ہے، ۲۹ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، اس میں غالب کی شاعری اور کمالات کا مختلف حیثیتوں سے تجزیہ اور انکی بوقلموں شخصیت کی عکاسی کی گئی ہے، اور غالب کے مذہب، انکی تصویروں، انکے بعض احباب و تلامذہ، نسخۂ حمیدیہ اور اسکے ناشروں و مرتب مفتی انوار الحق کے متعلق تحقیقی مضامین بھی ہیں، "جہان غالب" (قاضی عبدالودود) "غالب کے طرفدار نہیں" (ڈاکٹر مسیح الزماں) "غالب کی شاعری میں ترکیبیت" (ڈاکٹر سلام سندیلوی) "غالب کا آہنگ شعر اور بحروں کا استعمال" (ڈاکٹر مغنی تبسم) "غالب کے کلام میں تحریف و تصرف" (نادم سیتاپوری) "غالب کی غزلیہ شاعری میں دلی کا سماجی پس منظر" (ذکاء الدین شایاں) "غالب کا دربار اور خلعت" (امتیاز علی عرشی) اس حصہ کے اہم اور فاضلانہ مضامین ہیں، "بانداز نو" نئے ادیبوں "شوخی تحریر" مزاحیہ نگاروں، اور "کف گلفروش" خواتین اہل قلم کے مضامین کے لیے مخصوص ہیں، دوسرے متعدد عنوانات کے تحت شعراء کا منظوم ہدیۂ عقیدت، فیچر، ڈرامے، غالب پر ہندی اور مراٹھی زبانوں کے مضامین کے ترجمے، کئی یادگار تصویریں،

دیوان کی بعض غیر مطبوعہ شرحوں کے نمونے اور آخر میں آرٹ پیپر پر غالب کے فارسی و اردو کلام کا انتخاب اور انکی تصنیفات، دیوان کی شرحوں اور ان پر لکھی گئی کتابوں کا مکمل انڈکس ہے، ظاہر ہے کہ ایسے ضخیم نمبر کے سب مضامین ایک سطح کے نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے تمام مندرجات سے اتفاق ضروری ہے، تاہم اکثر مضامین مفید ہیں، اور ان کو سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اتنے گوناگوں اور مختلف النوع مضامین کو جمع کر لینا مرتبین کا اعجاز ہے، اور یہ نمبر صف اول کے غالب نمبروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

اردو ادب غالب نمبر :- مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۰۴، قیمت للعہ پتہ مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

انجمن ترقی اردو ہند نے بھی اپنے سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" کے سال رواں کا پہلا شمارہ غالب نمبر نکالا ہے، جو ایک درجن سے زیادہ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، لائق مدیر نے غالب کی عظمت دلکش انداز میں دکھائی ہے، ڈاکٹر گیان چند نے معتقد و معترض کے بجائے غالب کے نقاد کا فرض انجام دیا ہے، "مرزا غالب، ایک مطالعہ" (ڈاکٹر نعیم احمد) "غالب اور بیدل" (حسن عسکری بلکھنوی) "نسخۂ حمیدیہ، چند غلط فہمیوں کا ازالہ" (ڈاکٹر ابو محمد سحر) "غالب، تحقیق، اپریل فول" (نادم سیتاپوری) اور دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) کی کہانی کتابت سے گمشدگی تک (ڈاکٹر سید حامد حسین) اہم اور قابل ذکر مضامین ہیں، "غالب کے خطوط کی ادبی افادیت" پر احمد ابراہیم علوی اور "پیکر غزل" پر (ذکاء الدین شایان) کے مضامین قابل توجہ ہیں، آخر میں غزلوں اور نظموں کی چاشنی ہے، مضامین سب سنجیدہ، متوازن اور ادبی و تنقیدی حیثیت سے مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ یہ غالب نمبر بھی دلکش اور خاصے کی چیز ہے۔

علم و فن غالب نمبر :- مرتبہ جناب ناز انصاری، سلطان احمد، انیس الرحمٰن دہلوی صاحبان تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۴۴، قیمت [illegible] پتہ مکتبہ علم و فن، ۵۱۰ مٹیا محل دہلی ۶۔

یہ رسالہ علم وفن کا غالب نمبر ہے، اس میں ماہرین غالبیات میں امتیاز علی عرشی، مالک رام، فراق گورکھپوری، اور خواجہ احمد فاروقی اور جشن غالب میں برطانیہ، اٹلی، چیکوسلواکیہ، جرمنی اور اور روس کے نمایندوں کے انٹرویو، صدسالہ تقریبات کی بعض تقریریں اور غالب کی عظمت پر دہلی اور علی گڑھ میں ہونے والے سمینار کی مکمل روداد درج ہے، سمینار کے ممتاز حصہ لینے والوں میں خواجہ غلام السیدین، رشید احمد صدیقی، یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین، قاضی عبدالودود، آل احمد سرور، آنند نرائن ملا، کوثر چاندپوری، خلیل الرحمن اعظمی، اور سمینار کے ناظم عابد رضا بیدار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، اس حیثیت سے یہ نمبر بڑا دلچسپ اور دوسرے غالب نمبروں میں ممتاز ہے، اس کے علاوہ غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق کئی ہلکے پھلکے مضامین ہیں، ان کے اردو و فارسی کلام کا انتخاب، تصنیفات، دیوان کی مشہور شرحوں اور غالب پر لکھی گئی کتابوں کے نام وسنہ اشاعت کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

تحریک غالب نمبر:- مرتبہ جناب گوپال متل صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، پتہ مکتبہ تحریک ۱۴۳ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۶

رسالہ تحریک کا غالب نمبر مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالب فہمی کے مدعیوں کی مضحک تصویر کشی کی گئی ہے، اور غالب کے فارسی روزنامچہ دستنبو کا مکمل اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔

پیام تعلیم سالنامہ:- مرتبہ مولوی محمد حسین حسان ندوی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۶۰ قیمت ۶؍ پتہ مکتبہ جامعہ، جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۲۵

رسالہ پیام تعلیم بچوں کا قدیم مشہور اور مصور رسالہ ہے، اسکے مفید اور دلچسپ مضامین بچوں کے ذوق واستعداد کے مطابق دلکش اور دلپسند ہونے کے علاوہ بڑے متنوع اور خاصے معلومات افزا بھی ہیں، یہ نیا سالنامہ بھی متنوع اور دلکش مضامین سبق آموز نظموں اور دلکش کہانیوں اور ڈراموں پر مشتمل ہے جس کو وہ شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے اور ان سے انکے معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

"ض"